اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

مجنوں گورکھپوری: شخصیت اور فن

جمال نقوی

پاکستانی ادب کے معمار

مجنوں گورکھپوری
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

مجنوں گورکھپوری
شخصیت اور فن

جمال نقوی

اکادمی ادبیات پاکستان

نگران اعلیٰ	:	فخر زمان
منتظم	:	محمد عاصم بٹ
تدوین وطباعت	:	سعیدہ درانی
اشاعت	:	2010
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	ماریہ پرنٹرز پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: -/190 روپے غیر مجلد: -/180 روپے

ISBN: 978-969-472-200-9

Pakistani Adab Ke Mamar

"Majnoon Gorakhpoori : Shakhseyat our Fun"

Compiled By

Jamal Naqavi

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

مجنوں گورکھپوری ایک صاحب اسلوب اور رجحان ساز شاعر افسانہ نگار، تنقید نگار، مترجم گزرے ہیں۔ وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم اور انتہائی لائق توجہ باب ہیں۔ ان کی تحریروں میں معاشرے کی بنیادی آفاقی انسانی قدروں کی ترجمانی کی گئی ہے۔

اس اشاعتی منصوبے کی پیش نظر کتاب ''مجنوں گورکھپوری: شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر معروف محقق جمال نقوی صاحب نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری، مجنوں گورکھپوری کی شخصیت اور فن سے بہتر طور پر آگاہ ہو سکیں گے۔

یہ کتاب مجنوں گورکھپوری کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہے۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' سلسلے کی کتاب ''مجنوں گورکھپوری: شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

پروفیسر مجنوں گورکھپوری معمارانِ ادب میں شامل ہیں۔ انھوں نے آدھی صدی سے کچھ زائد عرصے تک اردو ادبی دنیا میں فلسفہ، تاریخ، تنقید، افسانہ اور شاعری کے شعبے میں اپنے افکار و خیالات کو تحریروں اور تقریروں کے ذریعے کئی نسلوں تک پہنچایا ہے۔ ماضی کی طرح آج کی نسل بھی ان کے فکروفن سے استفادہ حاصل کررہی ہے اور آئندہ نسلیں بھی کرتی رہیں گی۔ کیونکہ ان کی تمام کتابیں برصغیر پاک وہند کی اعلیٰ درسگاہوں میں شاملِ نصاب ہیں۔

مجنوں صاحب کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی وسیع تر علمی و ادبی حیثیت کو مختصر وقت اور مختصر صفحات میں قلمبند کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے اور پھر مجھ جیسے طالب علم کے لیے یہ بڑا مشکل کام تھا جسے میں نے مجنوں صاحب کی دستیاب کتابوں اور ان کے بڑے صاحبزادے انجینئر ظفر عالم کی یادداشتوں کی مدد سے تحریر کیا ہے اور اس اہم کام کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے اپنے انتخاب پر پورا اترنے کی کوشش کی ہے۔

اِن نوازشات کے لیے میں انجینئر ظفر عالم اور محترم فخر زمان چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان اور ان کے رفقائے کار کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔

جمال نقوی

سوانحی حالات و مصروفیات

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کی اصلی تاریخ پیدائش ۱۰رمئی ۱۹۰۴ء مطابق ۲۳رصفر ۱۳۲۲ء بروز منگل ہے، جب کہ ابتدائی سرٹیفکیٹ میں ۱۰رجنوری ۱۹۰۴ء درج کی گئی ہے۔ ان کے والد گرامی اپنے وقت کی معروف شخصیت، ریاضی دان، سیاست دان، صحافی اور شاعر محمد فاروق دیوانہ، ایم ایس سی (ریاضی) علیگ تھے۔

مجنوں صاحب کی ابتدائی تعلیم سینٹ اینڈریوز سکول، گورکھپوری میں ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں وہیں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایف۔اے اور ۱۹۲۹ء میں سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور سے بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں اور دوسرا ایم۔اے، اردو میں کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۵ء میں کیا۔ اسی دوران یعنی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک انھوں نے بحیثیت لیکچرر شعبۂ انگریزی، سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھپور میں فرائض انجام دیے۔ ۱۹۳۵ء میں مجنوں صاحب مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے وابستہ ہوگئے اور جولائی تا دسمبر ۱۹۳۵ء لیکچرر شعبۂ انگریزی اور سربراہ تعلقات عامہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۳۶ء سے مئی ۱۹۳۷ء تک انگریزی اور منطق کے لیکچرر کی حیثیت سے انہوں نے میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور میں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد بطور پروفیسر انگریزی و صدر شعبۂ اردو سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور میں اُن کا تقرر ہوگیا۔ جولائی ۱۹۳۷ء تا دسمبر ۱۹۵۸ء وہ اسی کالج سے

وابستہ رہے اور جب گورکھپور میں یونیورسٹی قائم ہوگئی تو انھوں نے ستمبر تا اکتوبر ۱۹۵۸ء بحیثیت صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں کام کیا اور نومبر ۱۹۵۸ء میں آپ پھر علی گڑھ چلے گئے اور نومبر ۱۹۵۸ء تا مئی ۱۹۶۸ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر تاریخ ادب اردو اور ریڈر شعبۂ اردو فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۶۸ء میں مستقل طور پر پاکستان آ گئے اور کچھ عرصے بعد اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ کراچی سے منسلک ہو گئے۔ اس طرح درس و تدریس کا جو سلسلہ ۱۹۳۲ء میں شروع کیا تھا وہ ۱۹۷۸ء تک جاری رہا۔ درس و تدریس ان کی زندگی اور شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔

مجنوں صاحب کی زندگی میں دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ ایک تو ان کا گورکھپوری ہونا جبکہ پیدائش کے لحاظ سے ان کا تعلق موضع پلدہ عرف ملکی جوت ضلع بستی ہے اور ان کی تربیت اسی ضلع کے دوسرے گاؤں منجھریا میں ہوئی جو کبیر داس کے مدفن قصبۂ مگہر کے قریب ہے۔ یہ دونوں گاؤں تحصیل خلیل آباد میں واقع ہیں جو میر خلیل الرحمان حاکم مقرر کردہ اورنگ زیب عالمگیر کے نام پر ہے۔ یہ تاریخی بات ظفر عالم صاحب خلف رشید مجنوں گورکھپوری نے مجھے اپنے ایک انٹرویو میں اپنے والد کے حوالے سے بتائی۔ ان کا یہ انٹرویو مجلّہ ''پیش رفت، انٹرنیشنل'' کراچی کے شمارہ نمبر ۱۴۔۱۳ میں شامل گوشۂ مجنوں گورکھپوری میں شائع ہوا ہے۔

اس کے بارے میں مجنوں گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون ''مجھے نسبت کہاں سے ہے'' میں یوں تحریر کیا ہے:

> ''منجھریا سے ایک میل کے فاصلے پر آمی ندی کے کنارے گورکھپور اور بستی کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ جوار واقعی میری تربیت گاہ ہے۔ جہاں میں اپنی دادی کے ہاتھوں وہ بنا جو آج تک ہوں۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں اس کے متعلق کہی گئی نظم کا ایک شعر یہ ہے:

تیرا ہر گوشہ کہ منزل گاہ الہامات ہے

مکتبِ عرفاں ہے یا گہوارۂ جذبات ہے

یہیں میں نے ۱۴ سال کی عمر تک بہترین تعلیم پائی۔ یہیں میرا شعور بالغ ہوا اور یہیں میرے اندر وہ ذوق جمال پیدا ہوا۔ اسی جگہ میرے بہترین افسانے لکھے گئے۔ اگر میری پرورش اور تعلیم بستی میں ہوئی تو تعلیم کی تکمیل گورکھپور میں ہوئی۔ بستی میرا اصل وطن سہی گورکھپور میرا وطن مالوف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا ددھیال ضلع بستی ہے اور ننیہال شہر گورکھپور ہے۔"(۱)

اعلیٰ تعلیم کے لیے گورکھپور آئے تو بس وہیں کے ہو رہے، اور پھر یہ چھاپ اور یہ نسبت ان کے نام کا حصہ بن گئی۔ دوسری اہم بات ان کا منفرد تخلص ہے۔ یعنی مجنوںؔ، ایسا ہی منفرد تخلص ان کے والد کا تھا یعنی دیوانہؔ، جبکہ ان دونوں باپ بیٹوں میں دیوانگی کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر نظر آتی ہے تو علم و فضل اور فرزانگی کی صورت جس کی بنیاد پر جناب محمد فاروق دیوانہ اور احمد صدیق مجنوں دونوں ہی ذکاوت اور ذہانت کی مثال تھے جیسا کہ مجنوں صاحب کے چھوٹے بھائی حامد عمر صاحب نے ان کی وفات پر یہ شعر کہا:

فرزانگی کی دھوم رہی جسکی کہ کل تلک

کہتے ہیں لوگ آج وہ دیوانہ چل بسا

مجنوں صاحب نے تو یہ تخلص یہ سوچ کر اپنایا تھا کہ شاید یہ تخلص کسی اور شاعر نے نہ اپنایا ہو مگر دس سال بعد جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ بہت عرصہ پہلے میر تقی میرؔ کے ایک شاگرد اور ان سے بھی پہلے جامیؔ ایک ہم عصر یہ تخلص اپنا چکے ہیں تو اس وقت تک وہ مجنوں گورکھپوری کے نام سے دنیائے ادب میں مقبول ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس وقت تخلص کی تبدیلی نامناسب تھی۔

گورکھپور میں مجنوں صاحب کا قیام امام باڑہ میاں صاحب سید جواد علی شاہ میں ۱۹۳۰ء سے کم و بیش تیس سال تک رہا۔ یہیں انہوں نے ایوانِ اشاعت قائم کیا اور رسالہ ''ایوان'' جاری کیا۔ ان کی بیشتر تصانیف بھی یہیں کی یادگار ہیں۔

کراچی آنے کے بعد انہوں نے یہاں اس وقت کے غیر آباد علاقے نارتھ ناظم آباد، بلاک این، میں سائپرس کے نام سے اپنے بڑے بیٹے کے گھر میں اپنی بیگم حمیرا خاتون، تینوں بیٹوں ظفر عالم، قمر عالم، بدر عالم، راحیل اور اکلوتی بیٹی تہمینہ اقبال کے ساتھ سکونت اختیار کی۔ پیرانہ سالی کے باوجود انہوں نے اپنا تخلیقی اور تدریسی سفر جاری رکھا اور ہندوستان کی طرح یہاں بھی علم و ادب کے دیوانے سائپرس میں حاضری دینے لگے اور ان کی علمی و ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ آخرش ۴ رجون ۱۹۸۸ء کو یہ چراغ علم و ادب ہمیشہ کے لیے کراچی میں گُل ہو گیا اور وہ سخی حسن قبرستان میں سپردِ خاک کر دیے گئے۔

تخلیقات، تصنیفات، تالیفات و ترجمہ

شاعری

بقول مجنوں صاحب شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو جس نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا مصرعے موزوں کرنے یا نظم نگاری سے نہ کی ہو۔ اسی طرح خود انہوں نے بھی اپنا ادبی اظہار شاعری سے شروع کیا تھا۔ اردو اور فارسی میں ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۱۶ء میں، ابھی جب ان کی عمر صرف بارہ سال کی تھی، اس سے کچھ پہلے ہی ہو چکا تھا۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۰ء تک انہوں نے مشاعروں میں شرکت کی لیکن باقاعدہ کسی کی شاگردی نہیں کی اور نہ اپنی شاعری کا کوئی مجموعہ شائع کیا، مگر تخلیقات ''نگار'' و ''ہزار داستان'' جیسے جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ اپنی ایک گفتگو میں انہوں نے بتایا کہ فراق گورکھپوری اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے (مجنوں کے) شعروں میں گز گز بھر کی اضافتیں ہوتی ہیں مگر علی جواد زیدی نے اپنے ایک مضمون میں یوں تحریر کیا ہے:

> ان کی پُر وقار علمیت ان کے اشعار میں اکثر در آتی ہے، اور اضافتوں، تلمیحوں اور استعاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن ارمغانِ مجنوں میں انہوں نے اپنے اشعار کا جو انتخاب کیا ہے اس پر فراق کی تنقید کم ہی چسپاں ہوتی ہے۔''(۲)

میں ارمغانِ مجنوں سے خوشہ چینی کر کے ان کے کچھ اشعار نذر قارئین کرتا ہوں:

باہمہ جشنِ عالم آرائی
زندگی انتظار و تنہائی

☆☆☆

بھنور میں ڈوبنے والے بھی ساحل تک پہنچتے ہیں
بھنور کا بھی تو آخر سلسلہ ساحل سے ملتا ہے

☆☆☆

گرداب نے یہ کس کا سفینہ ڈبو لیا
موجیں ہیں بے قرار تو ساحل اداس ہے

☆☆☆

عشق کیا ہے، اپنے اپنے ذوق کی تکمیل ہے
کوہکن خارا تراش و قیس صحرا آشنا

☆☆☆

یہ گمراہی یہ خود نا آگہی اچھی نہیں اے دل
کسی وادی میں کھو جا اور اپنی جستجو کر لے

☆☆☆

چنے تھے پھول جو مُرجھا کے رہ گئے سارے
مگر ابھی خلشِ نوک خار باقی ہے

☆☆☆

جانبِ دشت جو گلشن سے ہوا آتی ہے
سمن و گل کے چٹکنے کی صدا آتی ہے

☆☆☆

دل کی وسعت بھی کم نہیں مجنوںؔ
غم کی کچھ انتہا نہیں نہ سہی

☆☆☆

چھوڑ کر چند تنکوں کو بلبل
کچھ قفس ہے نہ کچھ آشیاں ہے

☆☆☆

پسِ فردائے آخر بھی الٰہی کوئی فردا ہے
قیامت آگئی وہ بے وفا اب تک نہیں آیا

☆☆☆

تھی طبیعت ہی کچھ اپنی مائلِ افسردگی
ہم لٹا کر فصلِ گل رنگِ خزاں دیکھا کیے

☆☆☆

جستجو زندگی کا حاصل ہے
اٹھ گیا جو قدم وہ منزل ہے

☆☆☆

عندلیبوں کی فغاں ہو یا گلوں کا ہو سکوت
آپ کو پہچانتا ہوں آپ کی آواز سے

☆☆☆

بہل نہ جائے کہیں رہ نورد منزل شوق
کہ راستے ہی میں کعبہ بھی بت کدہ بھی ہے

☆☆☆

گذر گیا ہوں گماں و یقین کی منزل سے
سمجھ لیے ہیں سب اسرار کفر و دیں میں نے

☆☆☆

یہ تاریکی، یہ سناٹا، یہ اضمحلال تاروں کا
قرینے کہہ رہے ہیں ہونے والی ہے سحر پیدا

☆☆☆

اے دل راحت طلب اے عاقبت نا آشنا
کہتے ہیں راحت جسے وہ موت کا پیغام ہے

☆☆☆

وہ فراق تھا کہ وصال تھا، کوئی خواب تھا کہ خیال تھا
ہمیں کچھ بھی یاد نہیں رہا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

☆☆☆

تقدیرِ رنگ و بو کے جو محرم ہیں ان کو کیا
گلزار میں بہار رہے یا خزاں رہے

☆☆☆

مجنوںؔ وہ بے نیاز تو ہم بے نیاز تر
ہم دست کش رہے، جو وہ دامن کشاں رہے

☆☆☆

جو تم ہو ساتھ تو سارا جہاں بدل ڈالیں
زمیں بدل کے ابھی آسماں بدل ڈالیں

☆☆☆

قیس و فرہاد و سرمد و مجنوں
سب کے سب اپنے گوں کے سودائی

مجنوں صاحب نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً بلبل، دل سے خطاب، محبتِ پارینہ کی یاد میں ایک عورت کے جذبات، وہ نظمیں ہیں جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ نواب مرزا شوق کی مثنوی ''زہرِ عشق'' اور عبرت گورکھپوری کی ''حسن فطرت'' ان کی تالیفات ہیں۔

دس گیارہ سال شعری دنیا میں گزارنے کے بعد مجنوں صاحب نے نثر کو اپنا وسیلۂ اظہار بنالیا۔ اس طرح شاعری میں بہت کمی ہوگئی اور نثر کے بحرِ ذخار میں جب وہ ڈوبے تو ڈوبتے ہی چلے گئے۔ ابتداً شعرِ منثور، یارومانی نثری تحریریں بھی امریکن شعراء اور ٹیگور سے متاثر ہوکر لکھیں اور نگار وغیرہ میں شائع بھی کروائیں۔ آخرش افسانہ نگار اور نقاد بن کر طلوع ہوئے۔

افسانہ، ناولٹ و ترجمہ

مجنوں صاحب کی شعرگوئی اور نثر نگاری کے ادوار کو الگ نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ وہ جس زمانے میں شعرگوئی کو اپنا روز کا مشغلہ بنائے ہوئے تھے اس زمانے میں بھی نثر لکھتے تھے۔ اردو نثر میں ان کا میلان ایسے علمی موضوعات کی طرف تھا جن کا اردو میں فقدان تھا۔ ''مشرق'' گورکھپور ۲۱۔۱۹۲۰ء میں کتب و رسائل پر ان کے تنقیدی تبصرے 'سبحان'' گورکھپور ۱۹۲۰ء میں 'صبح فلسطین' کے عنوان سے تاریخِ یہود کی دو قسطیں ''نقیب'' بدایوں جولائی ۱۹۲۲ء میں ''رونے والا فلسفی'' کے عنوان سے مضامین کے علاوہ اسی نوع کے علمی مضامین دوسرے رسائل میں بھی موجود ہیں۔

افسانہ نگاری کی طرف مجنوں گورکھپوری کو لانے کا سہرا جمیلہ بیگم بنتِ مہدی حسن افادی کے سر جاتا ہے جو مجنوں صاحب کی سالہار تھیں۔ اعلیٰ ادبی ذوق رکھتی تھیں اور نیاز فتح پوری

کی پرستار تھیں، جن کا ایک افسانہ ''شہاب کی سرگزشت''، 'نگار' میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ اس کے بارے میں مجنوں صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا:

''جمیلہ بیگم اس افسانے کی بڑی مداح تھیں۔ کئی بار اُسے خود پڑھ چکی تھیں اور مجھے سنا چکی تھیں لیکن مجھے یہ افسانہ متاثر نہ کر سکا۔ جس کا اظہار جب میں نے ان سے کیا تو انھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یہ سب نہ لکھ سکنے کی باتیں ہیں۔''

یہ مجنوں صاحب کے لیے ایک چیلنج تھا اور اسی رات ایک نشست میں انہوں نے اپنے افسانے ''زیدی کا حشر'' کا ایک تہائی حصہ لکھ کر صبح جمیلہ بیگم کو سنا دیا۔

''تم لکھ سکتے ہو''۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''اور تم سے اسی طرح لکھوایا جا سکتا ہے۔ جس طرح میں نے لکھوایا۔ اب اسے جلدی سے پورا کرلو۔''

لیکن مجنوں صاحب نے اسے مکمل نہیں کیا۔ جب نیاز فتح پوری گورکھپور آئے اور انہیں پتہ چلا تو انہوں نے اس مسودے کو اپنے قبضے میں کیا اور کہا:

''اب یہ قسط وار نگار میں چھپے گا۔ آپ اسے جلدی سے مکمل کریں۔''

''زیدی کا حشر'' نگار میں مئی ۱۹۲۵ء سے قسط وار چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ یوں مجنوں صاحب کی افسانہ نگاری و ناولٹ نگاری کا سلسلہ شروع ہوا جو ۱۹۳۷ء تک چلا۔ اُن کی یہ ساری تخلیقات اولاً ''نگار'' اور کچھ ''مرقع''، ''سروش''، ''ایوان'' میں شائع ہوئیں اور پھر کتابی صورت میں بھی طبع ہوئیں۔ اولین افسانوی مجموعہ ''خواب و خیال'' کو ملا کر تقریباً دس افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں سے ''زیدی کا حشر، بازگشت، من درچہ خیالم (صید زبوں)، سراب، گردش، سرنوشت اور سوگوار شباب (ہندی میں 'کنورکوٹ' ترجمہ فراق گورکھپوری) ناولٹ کی حیثیت رکھتے ہیں اور 'آغاز ہستی'، 'ابوالخمر' ڈرامے ہیں، جو حقیقتاً برنارڈ شا اور

ٹالسٹائی کے تراجم ہیں۔ تراجم تو مجنوں صاحب نے اور بھی کیے ہیں جن میں سالوی، آسکروائلڈ کا 'قابیل'، بائرن کا 'کنگ لیئر'، شیکسپیئر کا 'شمسون مبارز' ملٹن کا 'مریم مجدلانی'، مارس ماہترلنک کا 'سنگھاسن بتی' ہندی کی لوک کہانیوں کے تراجم ہیں۔ 'پردیسی کے خطوط' بھی جذبۂ افسانہ نگاری کے تحت تحریر کیے گئے ہیں۔ مجنوں صاحب کے دو طویل افسانے یا ناولٹ ''یادایام'' اور ''تنہائی'' ایوان، تنویر اور نقوش میں شائع ہوئے لیکن نامکمل اقساط پر مبنی ہیں۔

مجنوں گورکھپوری کا ذہن تو شاعری کے علاوہ تنقید کی طرف پہلے ہی سے متوجہ تھا جس کا ثبوت رسائل وجرائد میں اُن کے مطبوعہ مضامین سے ملتا ہے۔ افسانہ نگاری کے بارے میں تو جیسے کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے، یہ ایک چیلنج کے طور پر شروع کی گئی، لیکن ان کی تحریر کی کشش، حسنِ بیان اور سماجی حقائق کی وجہ قاری اور مدیر کی مسلسل طلب نے اُن کے افسانوی دنیا میں ایک مرتبہ داخل ہوجانے کے بعد واپسی کا راستہ دشوار کردیا تھا۔ نیاز فتح پوری کے 'نگار' کے لیے تو انہیں ہر ماہ ایک افسانہ بھیجنا ہی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر رسائل کے لیے بھی وہ لکھتے رہتے تھے اور دیگر زبانوں سے ناولوں کے تراجم اس کے علاوہ تھے۔ فکشن کے شعبے میں اتنی زودنویسی کے باوجودان کے اپنے منفرد اسلوب میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس منفرد اسلوب کا آغاز 'زیدی کا حشر' سے ہوتا ہے جو گو کہ نیاز فتح پوری کے افسانے 'شہاب کی سرگزشت' کو بنیاد بنا کر تحریر کیا گیا تھا لیکن مجنوں صاحب نے اس میں اپنا ایک منفرد اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے کردار کسی بیرونی معاشرے کے افراد ہونے کے بجائے اپنے ہی معاشرے کے کردار نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں محبت تو ہے لیکن جنسیت اور لذتیت نہیں ہے اور رومانویت تو ہے لیکن ذات پات اور مذہب وملت سے پاک۔ سیاست بھی ہے لیکن محبت کی تلخیاں بھلانے کے لیے۔

مجنوں صاحب کا دوسرا افسانہ ہارڈی کے ناول 'ٹیس' (Tess) کو بنیاد بنا کر تحریر کیا گیا ہے جس کا خاکہ فراق گورکھپوری نے پریم چند اور مجنوں گورکھپوری دونوں کو دیا تھا کہ

اس پر افسانہ تحریر کیا جائے۔ مجنوں صاحب نے جو افسانہ تحریر کیا اس کا عنوان 'گہنا' رکھنا جبکہ پریم چند نے اپنا افسانہ ہندی میں تحریر کیا اور اس کا عنوان 'بھوشن' رکھا۔

اس کے بعد 'نگار' میں شائع ہونے والے اس کے افسانے سمن پوش، حسن شاہ، مرقع میں شائع ہونے والے افسانے 'تم میرے ہو' اور رسالہ 'جن' میں شائع ہونے والی تخلیقات ان کے علوم باطنی و روحانیاتی علوم کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ بقول مجنوں صاحب ان افسانوں کا تعلق اس قیاسی اور فرضی دنیا سے ہے جس کا نام عالمِ ارواح رکھا گیا ہے۔ سمن پوش اسی وجہ سے بھی اہمیت اختیار کر گیا کہ علی گڑھ کے رہنے والے ایک شخص شفقت نے اس افسانے کا بہت گہرا اثر لیا۔ وہ اسے تواتر کے ساتھ پڑھا کرتا اور کہا کرتا کہ یہ افسانہ میری جان ہی لے کر رہے گا اور ایک دن افسانہ پڑھتے پڑھتے اس کی موت واقع ہوگئی۔ نگار نے اُسے شہیدِ سمن پوش کے نام سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ''سمن پوش''، ''سبز پری''، ''حسن شاہ''، ''محبت کا جوگ'' اور ''تم میرے ہو''، رومان پر مبنی ان پانچ افسانوں کا مجموعہ 'سمن پوش' کے نام سے ستمبر ۱۹۳۴ء میں ادارہ 'ایوان' گورکھپور سے شائع ہوا۔ 'حسنین کا انجام' ٹالسٹائی کے مشہور ناول 'اینا کرینینا' سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ اس میں انہوں نے کردار نگاری کو ایک منفرد جہت عطا کی ہے۔ انہوں نے اپنے اس افسانے کی ایک کردار 'ثریا' کو اینا کرینینا سے زیادہ معصومیت کا مرقع بنا کر پیش کیا ہے۔

'من در چہ خیالم' ۱۹۲۸ء میں نگار میں قسط وار شائع ہونے کے بعد ۱۹۴۴ء میں 'صیدِ زبوں' کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا لیکن ضروری ترمیمات کے ساتھ کیوں کہ ابتدأً ناکامیوں کو تقدیر کا سبب سمجھنے والے مجنوں گورکھپوری ۱۹۳۲ء کے بعد اس کا ذمہ دار سماجی نظام کی خرابی کو سمجھنے لگے تھے۔ اس نظریے کو سراب، سرنوشت اور گردش میں بہت واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔

بقول مجنوں صاحب، جب انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان نسل میدان میں آ گئی ہے تو انہیں اطمینان ہوا اور انہوں نے رفتہ رفتہ افسانے لکھنا کم کر دیے اور تنقید کی طرف متوجہ ہو گئے۔

فلسفہ وتنقید

یوں تو مجنوں صاحب نے پہلے بھی تاریخ اور فلسفے پر بہت کچھ لکھا جس کا کچھ تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔ مثلاً رونے والا فلسفی، صبح فلسطین، خواب اور تعبیر خواب، تاریخ جمالیات، برگساں اور شوپن ہار۔ آخرالذکر کتاب کو انہوں نے علامہ اقبال کو خصوصی طور پر بھیجا جنہوں نے کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے تحریر کیا کہ آج مجھے معلوم ہوا کہ اردو زبان بھی اس قابل ہے کہ اس میں فلسفہ کو ادب بنا کر پیش کیا جا سکے۔ یہ یقیناً مجنوں صاحب کے لیے بہت بڑا اخراجِ تحسین تھا۔
لیکن بقول مجنوں صاحب خالص ادبی تنقید انہوں نے ۱۹۳۰ء سے شروع کی جب ''زہرِ عشق'' مطبوعہ ایوانِ اشاعت میں انہوں نے مقدمہ کے طور پر ایک مضمون تحریر کیا، جسے انہوں نے تاثراتی اور تقابلی تنقید کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ان کا دوسرا تنقیدی مضمون ''میر اثر۔ خواب و خیال میں'' ہے، جو ''ایوان'' میں جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا جسے انہوں نے تجزیاتی یا تشخیصی تنقید کہا ہے۔ ایسا ہی ایک مضمون غنیمت کنجاہی کی فارسی مثنوی ''نیرنگ عشق'' پر بھی تحریر کیا جو ''ایوان'' میں شائع ہوا اور ایک مضمون محبت خاں محبت کی مثنوی ''اسرار محبت'' پر بھی ہے۔ ''تاریخِ جمالیات'' بھی ان کا ایک طویل مقالہ ہے جو ''ایوان'' میں ۱۹۳۱ء میں قسط وار شائع ہوا اور بعد میں کتابی صورت میں بھی چھپا۔

مجنوں صاحب نے اردو کے جن اساتذہ کے بارے میں تنقیدی مضامین تحریر کیے ان میں قائم چاند پوری، میر محمدی بیدار، مصحفی، میر درد، میر تقی میر، عبدالعلیم آسی، ریاض خیرآبادی، نظیر اکبرآبادی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور یاس یگانہ وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۳۶ء میں وہ نظریاتی تنقید کی طرف متوجہ ہوئے اور انقلاب آفریں مقالے 'ادب اور زندگی'، 'دنیا ادب کی ہے'، 'ادب اور ترقی'، 'ادب کی جدلیاتی ماہیت'، 'نئی اور پرانی قدریں'، 'تخلیق وتنقید'،

'حسن اور فن کاری'، 'شعروغزل'، 'ادب اور مقصدئیہ اور اس قسم کے کئی اور مضامین ان کی کتاب 'ادب اور زندگی' میں شامل ہیں اور جامعات کے نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں۔
''پردیسی کے خطوط'' ان کی ایک منفرد افسانوی اور تنقیدی تخلیق ہے جس کے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ مجموعی اعتبار سے ان کے چودہ تنقیدی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

تخلیقات و تصنیفات کا مختصر جائزہ

شاعری

شاعری مجنوں صاحب کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد مولوی محمد فاروق دیوانہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی اردو غزلیں اردوئے مُعلّیٰ میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہونے والی غزل بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

کیا کہیے شب جو حال دل بیقرار تھا
اب آئے وہ اب آئے یہی انتظار تھا
محوِ خرام ناز جو وہ گل عذار تھا
گلشن میں کس بہار پہ رنگ بہار تھا
تیرِ نظر سے میں مری، آہ رسا سے وہ
دونوں نہ بچ سکے کہ برابر کا وار تھا
خار الم کی دل میں خلش رات ہی سے تھی
دیکھا جو صبح کو تو جگر بھی فگار تھا
اہلِ غرض سے دور جو صحرا میں جا بسا
دیوانہ سچ تو یوں ہے بڑا ہوشیار تھا

مجنوں گورکھپوری نے بھی اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی۔ انھوں نے رنگ بہادر لال جگر کے مجموعۂ کلام 'یادگار جگر' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ سات سال کی

عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ گھر کا شاعرانہ ماحول، احباب کی شعری محفلیں، طرحی مشاعروں میں ان کی شرکت اور علمیت کی وجہ سے ان کی شاعری بھی قابلِ اعتنا ہے، جس کے کچھ نمونے تو پچھلے صفحات میں دیے گئے ہیں۔ یہاں ان کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو "افکارِ نو" مرتبہ دائرۂ ادب گورکھپور مطبوعہ ۱۹۵۸ء سے لیے گے ہیں:

حسن و الفت کی جو داستاں ہے
کچھ حقیقت، کچھ اپنا بیاں ہے
فصل کیا ہستی و نیستی میں
منزل یک نفس درمیاں ہے
چھوڑ کر چند تنکوں کو بلبل
کچھ قفس ہے نہ کچھ آشیاں ہے
ہے تیری اور کچھ بات مجنوں
یوں تو ہونے کو سارا جہاں ہے

پنے پہلے افسانوی مجموعے 'خواب وخیال' کا انتساب بھی مجنوں گورکھپوری نے منظوم کیا ہے۔ حُسن کے بارے میں ایک فنکار کی پروازِ تخیل ان اشعار سے نمایاں ہے:

اے شاہدِ شاہداں سلامت
اے کعبۂ عاشقاں سلامت
تیرا ہی ظہور چار سو ہے
اب میری نظر میں تو ہی تو ہے
ہر بات تری، ترا فسانہ
ہر سانس مری ترا ترانہ
تجھ سے یہ جہانِ رنگ و بو ہے

اب میری نظر میں تُو ہی تُو ہے
خورشید سحر میں نور تیرا
تُو ہی ہے رات کا اندھیرا
اے روح و روانِ نور ظلمت
میرے لیے زندگی کی جنت
آنکھوں کو جس طرف اٹھایا
کچھ تیرے سوا نظر نہ آیا
اے تُو کہ ہے شش جہت پہ چھائی
مجھ میں بھی تری ہوئی سمائی
ہر بات مری ترا فسانہ
ہر سانس مری ترا ترانہ

محبت اور حُسن کے بارے میں مجنوں گورکھپوری کے تصورات ان کی شاعری میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا حُسن ہے جس نے محبوب کے تصور کو پرستش کے مرتبے تک پہنچادیا ہے۔ مجنوں صاحب نے اپنی شاعری میں سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ انہوں نے اپنے اس اسلوب بیاں کے ساتھ بڑے اہم موضوعات کو بھی چھیڑا ہے اور بڑی دوررس باتیں بھی کی ہیں جن سے قاری کو علم و عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ماہنامہ 'ایوان' گورکھپور نومبر، دسمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہونے والی ان کی ایک رباعی میرے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے:

دنیا کو جائے کامرانی سمجھے
اک کھیل تھا جس کو زندگانی سمجھے
اللہ رے فریب سیمائے ہستی
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھے

شاعری میں غزل اور رباعی کے علاوہ مجنوں صاحب نے نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تخلیق کردہ کئی نظموں کا تذکرہ پہلے بھی کیا جاچکا ہے۔ ان کی بہترین نظم 'بلبل' کا ایک نمونہ دیکھیے:
یہ نظم رسالہ 'ایوان' گورکھپور کے شمارہ اپریل ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی ہے:

ترا جہان ہے بالا جہانِ انساں سے
کہ بے نیاز ہے تُو حادثات امکاں سے
ترا فروغ، فروغ جمال جاناں ہے
ترا نشاط، نشاط گل و گلستاں ہے
تری حیات کا مقصد ہی دوستداری ہے
ترا معاملہ سود و زیاں سے عاری ہے
ازل کے دن سے ہے محوِ جمال جانانہ
رہے گی تا بہ ابد ماسوا سے بیگانہ
تجھے کس آگ نے حرص و ہوا سے پاک کیا
تمام خرمنِ ہستی جلا کے خاک کیا

مجنوں صاحب کی شاعری کوئی دل کی لگی یا کسی محبت کی چوٹ سے پیدا ہونے والی شاعری نہیں تھی بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی کہا بہت سوچ سمجھ کر اور شعر کے اصول و آداب سمجھ کر تحریر کیا۔ بیدلؔ اور غالبؔ ان کے پسندیدہ شعراء تھے، اس لیے خود ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ابتدا میں فارسی یا اردو میں جتنے بھی اشعار کہے ان میں انہی دونوں کے اثرات غالب ہیں۔

شاعری کے ساتھ ان کی بے اعتنائی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے اشعار کی کوئی بیاض نہیں رکھی اور نہ کوئی مجموعۂ کلام شائع کیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد انہوں نے مشاعروں میں بھی جانا چھوڑ دیا اور اپنی ساری توانائی اردو نثر کو دے دے۔ افسانہ نگاری کی ابتدا تو اس چیلنج سے ہوئی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مضمون نگاری اور تنقید ان کے ذوق مطالعہ اور فکرِ رسا کی دین ہے۔

افسانہ، ناولٹ اور ترجمہ

خواب و خیال

پہلی بار۱۹۳۱ء میں ایوانِ اشاعت، گورکھپور سے شائع ہونے والا یہ مجنوں گورکھپوری کا اولین افسانوی مجموعہ ہے جو۲۵۵صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں آٹھ افسانے شامل کیے گئے ہیں، جن میں خواب و خیال، شکستِ بے صدا، محبت کی قربانیاں طبع زاد ہیں جبکہ باقی پانچ افسانے مغربی ادب کے تراجم ہیں۔

اس مجموعے میں شامل ان کا پہلا افسانہ ''خواب خیال''، ان کے طالبعلمی کے دور کا افسانہ ہے جس میں ان پر شوپن ہار کے اثرات پوری طرح چھائے ہوئے تھے، اور وہ انسان کو مجبور محض تصور کرتے تھے۔ افسانے کے کرداروں نسیم اور ثریا کی بےلوث محبت میں مجنوں صاحب کی جمیلہ بیگم ناہید سے عقیدت کی تصویر نظر آتی ہے۔

''مدفنِ تمنا'' اسی مجموعے کا دوسرا افسانہ ہے، جو فنی اعتبار سے خواب و خیال سے کمتر ہے۔ اسی لیے۱۹۳۰ء میں تخلیق پانے کے باوجود دوسرے نمبر پر ہے۔ اس میں پلاٹ اور مکالمہ نگاری کی کمزوری بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

مجموعے کا تیسرا افسانہ ''بیگانہ'' ہے جو اپنے حسین تاثر کی بنیاد پر کامیاب ہے۔ اس افسانے میں کرشن کماری کے جاندار کردار کے ساتھ ہی بیگانے کا ارتقائی کردار افسانے کی کامیابی کا غماز ہے۔ کرشن کماری کوڑھ کی مریضہ ہے اس لیے وہ بیگانہ کی قربت سے انکار کر کے راہبہ بن جاتی ہے اور بیگانہ کی محبت اسے پاگل بنا دیتی ہے۔

''شکستِ بے صدا'' میں ناصری کا کردار خود مجنوں صاحب کی تصویر نظر آتا ہے جسے شاعر، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے پیش کی گیا ہے اور اسی مناسبت سے طلعت کی خوبصورتی کے ساتھ ہی اس کی ذہانت اور تعلیم کو بھی نمایاں کر کے اس سے فلسفیانہ بحثیں کروائی گئی ہیں۔ بیانیہ انداز میں اس افسانے کا ارتقاء اور وحدت تاثر ہی قاری کی دلچسپی اور افسانے کی کامیابی کی غماز ہے۔

''محبت کی قربانیاں'' ایک تاریخی افسانہ ہے جس میں شمیم، کملاوتی سے اپنی محبت کو وطن کی محبت پر قربان کر دیتا ہے۔ کام کی زیادتی سے سِل کی بیماری میں مبتلا ہو کر پہلے شمیم اپنی جان دے دیتا ہے اور پھر اس کے ہی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کملاوتی بھی اپنی جان وطن پر قربان کر دیتی ہے۔

''صناع کا راز'' فن مصوری کے حوالے سے تحریر کردہ ان کا خوبصورت افسانہ ہے جس میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہی شاہکار فن کی بلندی پر پہنچتا ہے اور عروج کا درجہ حاصل کرتا ہے جس میں فن کار کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے۔

''گوہرِ محبت'' تخیل کے نامکمل ہونے کی کہانی ہے جو تعمیر کو منہدم اور ملکہ کی آخری یادگار تابوت میں بند اس کے جسدِ خاکی کو ہٹانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ افسانہ اپنے قاری کو یہ پیغام دیتا ہے کہ کسی یادگار کا قیام باطل پرستی کی نشاندہی کرتا ہے۔

''ظفر کا باپ'' اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے جس میں جوانی کی لغزش، قانون کی بالادستی اور بچوں کی نفسیات کو بنیاد بنا کر مجنوں صاحب نے کہانی کے تانے بانے جوڑے ہیں۔ برائی کی علامت خلیل کے مقابلے میں محسن کے نیک اور صالح کردار کو مجنوں صاحب نے بڑی خوبصورتی سے کہانی کا روپ عطا کیا ہے۔ افسانہ کامیاب ہے اور اپنے قاری سے داد و تحسین کا حقدار ہے۔

سمن پوش اور دوسرے افسانے

یہ مجنوں گورکھپوری کے ان شائع شدہ اور پسندیدہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن کا تعلق روحانیات سے ہے۔ یہ دوسرا افسانوی مجموعہ سمن پوش، سبز پری، حسن شاہ، محبت کا جوگ اورتم میرے ہو یعنی کُل پانچ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اولاً ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ۱۹۳۴ء میں شائع ہونے والا یہ افسانوی مجموعہ مجنوں صاحب کا مقدمہ گریز، شہید سمن پوش کے ذکر، افسانہ کا افسانہ اور روحانیات کے بارے میں رسالہ 'جن' بابت جنوری ۱۹۳۰ء میں ان کے شائع ہونے والے مضمون ''دنیائے آب و گل سے دُور'' سے مزیّن ہے۔

انہوں نے اس مجموعہ کی پہلی اشاعت کے وقت یعنی ۱۹۳۴ء میں ہی یہ تحریر کر دیا تھا کہ:

''افسانہ ان کی ادبی زندگی کا نصب العین نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔''

زندگی کی ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے ماننے والے انہیں افسانہ نگار کے طور پر جانتے ہیں اور اکثر یہ چاہتے ہیں کہ وہ افسانے کے سوا کچھ اور نہ تحریر کریں۔ اس لیے وہ پڑھنے والوں کے لیے اس وقت تک افسانہ نگاری کرتے رہے جب تک اس شعبے میں دوسرے لکھنے والے نہیں آگئے۔

روحانیات کے بارے میں انہوں نے اپنے بسیط مضمون میں تحریر کیا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو روحانیات کے مبلغ ہیں لیکن وہ اس کے دعاوی کو لغو اور لاطائل نہیں سمجھتے۔ حیات بعد الحمات میں ان کے لیے کوئی دلکشی نہیں۔ کیوں کہ ان کے بقول انہوں نے اس زندگی میں کیا کیا یا ان کو کیا ملا جو کسی آئندہ زندگی پر وہ دلچسپی کے ساتھ غور کریں لیکن یورپ اور امریکہ میں باضابطہ انجمنیں قائم ہیں جو عرصے سے روحانیات کے متعلق تحقیقات کر رہی ہیں۔

روحانیات جدید میں مسمر (MESMER) اور سویڈن برگ (SWEDEN BORG) کے

نام تاریخی شہرت رکھتے ہیں۔ مسمر وائنا کا ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کے 'معالجات نفسی' کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ دور دور سے لوگ اس سے اس فن کو سیکھنے کی غرض سے آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے 'مسمریزم' کا لفظ لغت میں آگیا۔ مسمر کو یہ بھی تجربہ ہوا تھا کہ 'تنویم' (HYPNOTISM) سے نہ صرف مریض کا علاج کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے فرض کو آپ پہچان لے اور اس کا معقول مداوا کرسکے۔ انہوں نے تحریر کیا کہ:

''فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آج بڑے بڑے ماہرینِ نفسیات اس بات کے ماننے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ عالم ارواح سے مراسلے اور مکالمے ہوسکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے پردہ میں نہ جانے کتنی شعبدہ بازیاں اور فریب کاریاں بھی کام کررہی ہیں لیکن محض اس بنا پر ہم کو حقائق سے بھی انکار نہیں ہوسکتا۔''(۳)

مزے کی بات یہ ہے کہ اتنے خوبصورت رومانی اور تحیّر آمیز روحانیات سے متعلق افسانے لکھنے کے بعد جب مجنوں صاحب نے اس CHAPTER کو بند کردیا تھا اس کے بعد بھی نئے سنگین اور اہم مسائل پر افسانے لکھنے کی خواہش ان میں باقی رہی۔ اس بارے میں انہوں نے تحریر کیا:

''میں خود اب افسانے نہیں لکھتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ اوّل تو مجھے فی الحال اتنی فرصت اور فراغت میسر نہیں کہ بیٹھ کر کسی افسانے کی تشکیل کروں۔ دوسرے میں جیسے افسانے اب لکھنا چاہتا ہوں ان کے لیے خارجی اسباب وحالات ابھی تیار معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن اب اردو میں کیسے افسانے لکھے جائیں اس کی ایک نہایت واضح تخیل مرے ذہن میں موجود ہے اور نئے میلانات کے جتنے افسانے اس وقت

لکھے جا رہے ہیں باوجود اس کے کہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں لیکن
مری تخیل سے کسی نہ کسی اعتبار سے الگ ہوتے ہیں۔ اگر زندگی رہی اور
فرصت واطمینان کے لمحے میسر ہو گئے اور پھر اگر حالات وعوارض نے
اجازت دی تو بہت ممکن ہے میں پھر افسانے لکھوں اور اپنی نئی تخیل کو پیش
کرنے کی کوشش کروں۔"

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا (۴)

'سمن پوش' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ تلازمۂ خیال پر مبنی جس کا پلاٹ مجنوں صاحب نے اتنی خوبصورتی سے تیار کیا ہے کہ قاری اس ماورائی ماحول اور ان کے کرداروں میں ایسا کھو جاتا ہے کہ یہ طلسم اس وقت ٹوٹتا ہے جب افسانہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس وقت قاری کو ناہید کی مظلومیت پر ترس آتا ہے اور جمال کی جذباتیت اور جلد بازی پر افسوس، جس کی وجہ سے اس نے اپنی دنیا خود ہی اجاڑ لی اور آخرش خودکشی کر لی۔ افسانے کا مرکزی خیال بعد از مرگ روح کا وجود اور اپنی بیتابی کا اظہار ہے۔ مجنوں صاحب نے افسانوی کردار سہیل کی صورت میں اپنے خیالات وتصورات بہت خوبصورتی سے افسانے میں ڈھالے ہیں۔

مجموعے کا دوسرا افسانہ 'سبز پری' ہے، جس میں دو کرداروں رشید اور بلقیس کو محبت کا اسیر بتایا گیا ہے لیکن ایک دن رشید نے بلقیس کی محبت کو ٹھکرا کر کسی اور سے شادی کر لی۔ مگر بلقیس نے آخری عمر تک اس محبت کو نبھایا۔ مرنے کے بعد اس کی روح نے رشید کی اولاد شاہد کو سبز پری کے روپ میں اپنی محبت کا دیوانہ بنا کر اس دنیا سے چھین کر عالمِ ارواح میں اپنا ساتھی بنا لیا۔ عالمِ ارواح کے بارے میں مجنوں گورکھپوری نے اپنی معلومات کو یوں تحریر کیا ہے:

"مرنے کے بعد انسان کی روح نہ صرف زندہ رہتی ہے بلکہ اس کی پوری

فردیت باقی رہتی ہے۔ اگر انسان زندگی میں نا آسودہ ہے تو مرنے کے
بعد بھی نا آسودہ رہتا ہے اور یہی مکافات عمل ہے۔(۵)

'حسن شاہ' اس افسانوی مجموعے کا تیسرا افسانہ ہے۔ جس میں مجنوں صاحب نے اپنے اس یقین کو افسانوی رنگ دیا ہے کہ عالم ارواح سے مکالمے اور مراسلے ممکن ہیں۔ افسانے کا اہم کردار حسن شاہ سعیدہ کی محبت کا اسیر تھا مگر سعیدہ شادی سے ایک دن پہلے ہلاک ہو جاتی ہے۔ حسن شاہ باقی عمر سعیدہ کی محبت اور عالم ارواح سے وصول ہونے والے اس کے مراسلوں کے ساتھ گزار دیتا ہے اور آخر کار روحِ سعیدہ سے جلد ملنے کا اشارہ پا کر خودکشی کر لیتا ہے۔

چوتھا افسانہ 'محبت کا جوگ' ہے۔ جسے انہوں نے ہپناٹزم اور نفسیاتی بیماریوں کے سہارے افسانوی انداز میں بہت خوبصورتی اور کمال ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ ہرنام سنگھ کو پربھا کی محبت میں جو ناکامی ہوئی اس کا انتقام اس نے پربھا کی بیٹی پریما کو قتل کر کے لیا۔ اپنے اس جرم کا ارتکاب اس نے ہپناٹزم کے ذریعہ ایک دوسرے قالب میں داخل ہو کر کیا۔ یہ دوسرا قالبؔ پریما کے عاشق کا تھا جس نے اس جرم کی سزا پاگل خانے میں رہ کر پوری کی۔ آخر سادھو ہرنام سنگھ اسے ہر ماہ ایک ہفتے کی خواب کی بیماری کے ذریعہ پریما سے اس کی ملاقات کا مژدہ دے کر خودکشی کے ذریعہ اپنی ذات سے بھی انتقام لے لیتا ہے اور یوں افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ افسانہ ابتدا سے انجام تک قاری کو اپنے سحر میں گرفتار رکھتا ہے۔

مجموعے کا آخری افسانہ 'تم میرے ہو' مکافات عمل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کی نا آسودگی مرنے کے بعد روح کو بھی نا آسودگی ہی دیتی ہے۔ ڈاکٹر ابوظفر کی بیگم سائرہ سے جمیل کی محبت۔ یہ دو طرفہ آگ دوریوں کے باوجود ان دونوں کی زندگیوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ مگر اس کی روح 'تم میرے ہو' کی تکرار کے ساتھ جمیل سے اپنی وابستگی کو دہراتی رہتی ہے۔ بیانیہ انداز میں یہ مجنوں صاحب کا ایک بہترین افسانہ ہے۔

ھتیا اور دوسرے افسانے (مجنوں کے افسانے)

سات افسانوں اور ۱۸۰ صفحات پر مشتمل مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'حالی پبلشنگ ہاؤس' دہلی سے پہلی بار ۱۹۳۵ء میں 'ہتیا اور دوسرے افسانے' کے نام سے اور دوسری بار ۱۹۳۸ء میں 'مجنوں کے افسانے' کے نام سے شائع ہوا۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'ہتیا' ہے جو ہارڈی کی ٹیس سے ماخوذ ہے۔ وجہ تخلیق بتاتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے دیباچہ میں تحریر کیا:

''شام کو ایک بھکارن جو ذات کی گوالن تھی، بھیک مانگنے آئی اور ٹیس کی یاد دلا کر چلی گئی اور ٹیس کا ہندوستانی الم نامہ تیار ہو گیا۔''(۶)

محبت اور انتقام اس افسانے کا مرکزی خیال ہے جس میں مجنوں صاحب نے ہندوستانی سرمایہ دارانہ نظام پر بھرپور تنقید کی ہے اور اسے بہت سی برائیوں کی جڑ بتایا ہے۔ جو نچلے طبقے کی خراب حالت کا ذمہ دار ہے۔

''رام ہرکھ تیواری کی پنجاہ سالہ زندگی میں بے چارے کو کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا بھی میسر نہیں ہوا تھا۔ سرمایہ داروں کی زندگی پر غور کیجئے۔ جو رقم ان کے پان اور سگریٹ کے ایک دن کے لیے کافی نہیں ہوتی، اتنی رقم سے پورا خاندان چار دن تک اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔''(۷)

تیواری کی خوبصورت بیٹی سرلا سے گائے مارنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ وہ معاشرے کے سربراہ ہری سنگھ کے گھر پر بھیک مانگنے جاتی ہے اور اس کی عصمت لوٹ لی جاتی ہے۔ اسے ناجائز اولاد جنم دینے پر گاؤں سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ بچے کو قتل کر کے ہری سنگھ اور اس معاشرے سے اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ دوسرے گاؤں کے مذہب میں پناہ لیتی ہے اور کامتا سے بیاہ کر لیتی ہے مگر مذہب بھی اس کو معاف نہیں کرتا۔ پنڈت اسے منحوس قرار دیتا ہے اور کامتا

چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہری سنگھ اس سے بیاہ کر لیتا ہے۔ اسی دوران کامتا آجاتا ہے اور جبر کے مقابلے میں محبت کو ترجیح دیتی ہے اور ہری سنگھ کے قتل کے الزام میں جیل چلی جاتی ہے اور یہیں افسانے کا اختتام ہو جاتا ہے اور برائی اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔

اس افسانوی مجموعے کا دوسرا افسانہ 'گہنا' ہے۔ جس کی وجہ تخلیق کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا ہے۔ خوبصورت رادھا کا اپنے شوہر رام لعل سے گہنوں کا مطالبہ ہی اس کہانی کی بنیاد ہے۔ رام لعل زیوروں کے حصول کی خاطر شہر چلا جاتا ہے۔ ادھر رادھا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہریش چندر کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کر لیتی ہے۔ جب رام لعل زیوروں کے حصول کے بعد واپس آ کر رادھا کو نہیں پاتا تو خودکشی کر لیتا ہے۔ اس طرح رادھا کی گہنوں کی فرمائش اُسے محرومی اور موت سے ہمکنار کرتی ہے۔

'حسنین کا انجام' مجموعے کا تیسرا افسانہ ہے۔ جو'زیدی کا حشر' میں حسنین کے نامکمل کردار کو مکمل کرنے کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس طرح اسے 'زیدی کا حشر' کا دوسرا حصہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ انسانی بہمیت، معصیت اور سفلی جذباتیت پر مبنی حسنین کا کردار مجنوں صاحب نے بڑی ہنرمندی سے تیار کیا ہے جو کئی کنواری اور شادی شدہ عورتوں کو اپنے جال میں پھنسا کر جنسی لذت حاصل کرتا ہے اور انہیں تڑپتا چھوڑ جاتا ہے۔

چوتھا افسانہ 'مراد' ہے، جس کا ہیرو ہاجرہ سے محبت کرتا ہے مگر جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر یورپ سے واپس لوٹتا ہے تو ہاجرہ مر چکی ہو تی ہے اور وہ اسی غم کو بھلانے کے لیے شراب کا سہارا لیتا ہے اور مجبوراً آمنہ سے شادی کر لیتا ہے جو ایک دوسرے شخص شاہد کو پسند کرتی ہے مگر مراد سے شادی کے بعد اسے سدھارنے کی کوشش کرتی ہے جو بیٹے ظفر کی ولادت کے باوجود اپنی عادتیں نہیں چھوڑ پاتا۔ آخرکار وہ آمنہ کو آدھا ترکہ دے کر بمبئی چلا جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ ادھر شاہد آمنہ کے بیٹے ظفر کی بیماری میں اس کی تیمارداری کر کے آمنہ کا دل جیت لیتا ہے اور ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس

افسانے میں آمنہ کو ایک وفا شعار بیوی، مراد کو پہلی محبت کا دیوانہ اور شاہد کو سچے عاشق کو طور پر دکھایا گیا ہے۔

'جشن عروسی' پانچواں افسانہ ہے جو خالصتاً رومانی ہے۔ سلیم اور اس کی عمزاد بہن زلیخا کی داستانِ محبت ہے۔ سلیم کو حرم سرا کے ناظم ہارون سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم کے چچا جعفر پاشا نے سلیم کے والد عبداللہ کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے سلیم کو لاوارثوں کی طرح پالا اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹی زلیخا سلیم سے محبت کرے۔ مگر محبت جو ایک فطری عمل ہے، کسی رکاوٹ سے ختم نہیں ہو سکتی۔ آخرکار جعفر پاشا کی گولی سے سلیم تو ختم ہوتا ہی ہے مگر زلیخا بھی صدمے سے مر جاتی ہے اور یہی افسانے کا اختتام ہے۔

چھٹا افسانہ 'بڑھاپا' جو حقیقتاً چیخوف کے ایک افسانے سے ماخوذ ہے، اس میں ماضی کی یادوں کے سہارے احمد، اس کی بیوی سکینہ اور مولوی طفیل احمد کے متضاد کرداروں سے مجنوں صاحب نے معاشرے کی ایک عام مگر اہم بات کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ وہ ہے مذہب کی بدنامی جو عام طور پر ایسے لوگ کرتے ہیں جو اپنے کو مذہب کا ٹھیکیدار بتاتے ہیں اور ظاہری طور پر پکے مذہبی نظر آتے ہیں مگر ان کا باطن سیاہ ہوتا ہے۔ جب انہیں اپنا انجام نظر آتا ہے تو وہ گناہوں سے توبہ کرنے لگتے ہیں۔ کہانی کا اختتام اس پر ہوتا ہے کہ مولوی طفیل کو قبرستان پہنچ کر اپنی موت بھی یاد آجاتی ہے۔

'کلثوم' مجموعے کا ساتواں افسانہ ہے جس کا مرکزی خیال موپساں کی کہانی سے لیا گیا ہے اور محبت ہے۔ محبت جو انسان کو پاگل کر دیتی ہے اور وہ وقتی طور پر اپنے اچھے اور برے کے بارے میں تمیز نہیں کر پاتا۔ کلثوم قدرت کی دی ہوئی خوبصورتی کو سنبھال نہیں پاتی اور شہباز کے ساتھ جذباتی ہو کر اپنا نقصان کر بیٹھتی ہے اور کسمپرسی کی حالت میں مر جاتی ہے۔ افسانہ سماجی حقائق کا آئینہ دار ہے۔

آٹھواں اور آخری افسانہ 'محبت کا دم واپسیں' ہے جو بقول مجنوں صاحب صرف چند مقامات کی سیر کا نتیجہ ہے، کوئی خاص واقعہ اس کی بنیاد نہیں ہے۔ مگر اس میں عورت کی نفسیات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے جس کے مجنوں صاحب ماہر تھے۔ مریم کا کردار بہت مشکل تھا مگر اسے بڑی ہنرمندی سے بُنا گیا ہے، کیوں کہ جس بردباری سے وہ اپنے شوہر ارشاد کو نورالنہار سے محبت کو برداشت کرتی ہے اس سے اس کا کردار قارئین کو ہمیشہ یاد رہے گا۔

نقش ناهید

۱۴۴ صفحات پر مشتمل مجنوں گورکھپوری کا چوتھا افسانوی مجموعہ 'نقشِ ناہید' ہے، جو ایوانِ اشاعت گورکھپور سے مئی ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا اور اس میں چھ(۶) افسانے شامل ہیں۔ نقشِ ناہید مجموعے کا پہلا افسانہ بھی ہے۔ روسی کہانی 'سائیکی' کو انہوں نے ہندوستانی پس منظر میں افسانے کا روپ دیا ہے۔

استاد، شاعر، ادیب اور آرٹسٹ رمزی، ناہید کا پرانا عاشق ہے ۔جس کی ایک منفرد خواہش ناہید کے پاؤں کو بوسہ دینا ہے۔ وہ ناہید کو حاصل تو نہ کر سکا مگر ایک عرصے بعد اسے ناہید کی قربت حاصل ہوجاتی ہے اور وہ اپنی دیرینہ خواہش پوری کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی بات معاملہ بندی تک پہنچ جاتی ہے۔ آخر کار وہ مرجاتی ہے اور رمزی بھی خودکشی کر لیتا ہے۔ خوبصورت مکالمے افسانے کی کامیابی ہیں۔

'سالگرہ' مجموعے کا دوسرا افسانہ ہے۔ مجنوں صاحب نے خط کے پیرائے میں ایک خوبصورت افسانہ امریکی کہانی A Paragraph and a letter سے متاثر ہو کر تحریر کیا ہے۔ جس میں زندگی کے دو رُخ دکھائے گئے ہیں۔ ایک طرف تو نامور ادیب و شاعر ادیب جعفری ہے جس کی مدح سرائی تو بہت ہوتی ہے مگر کوئی اس کو بنیادی ضروریات یعنی روزی،

روٹی اور کپڑے کی طرف توجہ نہیں دیتا اور دوسری طرف اس کی بیوی نگہت ہے جو اس کی مفلسی کے باوجود اسے دل وجان سے چاہتی ہے اور اسی کو سچی محبت کہتے ہیں۔

اس مجموعے کا تیسرا افسانہ 'لذتِ آزار' ہے۔ یہ افسانہ بھی خطوط کے طرز پر تحریر کیا گیا ہے۔ جو نزہت کے نام تحریر کیے گئے ہیں۔ حقوق انسانی پر تحریر کردہ اس افسانے میں انسانوں سے بیگار لینے کے طریقۂ کار کی کھل کر مذمت کی گئی ہے۔ مجنوں صاحب ان خطوط میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

> ''میرے تمام مقبوضات چھین لیے جائیں، لیکن ان فلاکت زدہ آسامیوں کی زندگی کس طرح سدھر جائے اور ان کو کم از کم اس قدر آسائش و اکرام مل سکے، جس قدر بنی نوع انسان کو فطرتاً میسر ہونا چاہیے۔''

مجنوں صاحب زمیندارانہ اور جابرانہ نظام کے کس حد تک مخالف تھے اس کا اندازہ ان کی تخلیقات سے مکمل طور پر ہو جاتا ہے اور اسی سے ان کی ترقی پسند فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

'تصادم' اس افسانوی مجموعے کا چوتھا افسانہ ہے جس میں مجنوں گورکھپوری نے انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افسانے کے تانے بانے جوڑے ہیں۔ رحیم آباد اسٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پر مال گاڑی کھڑی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر شرما لائن کلیئرنس پر دستخط کرتا ہے۔ کلیئرنس کو کتاب سے پھاڑنے سے پہلے اسے پتہ چلتا ہے کہ ایک سواری گاڑی آنے والی ہے جسے پہلے روانہ کرنا ہوگا۔ اس وقت مال گاڑی کو روکے رکھا جائے۔ شرما پیٹ میں درد کی وجہ سے اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ ادھر مال گاڑی کا گارڈ شرما کی غیر موجودگی میں کلیئرنس پھاڑ کر لے جاتا ہے اور مال گاڑی روانہ ہو جاتی ہے۔ شرما واپس آکر مال گاڑی روکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ دونوں گاڑیوں میں تصادم کے نتیجے میں لاشیں، زخمی اور چیخ و پکار۔ ذرا سی غلطی بڑے حادثے کا سبب بن جاتی ہے۔

'محبت' کتاب کا پانچواں افسانہ ہے، جس میں محبت کو ایک متاع بے بہا بتایا گیا ہے جس کے بغیر عورت کا وجود ممکن نہیں ہے۔ عائشہ کی محبت نے اس زاہد خشک (جلال) میں جب حرکت بھی پیدا نہ کی تو اس نے عباس سے محبت شروع کی جس کا اختتام حاوی پر ہوا۔ مگر جب جلال کو علم ہوا کہ عائشہ عباس سے پہلے اس سے محبت کرتی تھی تو وہ کہتا ہے کہ:

"تم نے مجھے وہ دیا جو میں اتنی مدت کی عبادت گزاری کے باوجود حاصل نہ کر سکا۔"

'محبت کا مزار' کتاب کا آخری افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بھی ہنری جیمس کی کہانی "دی آلٹر آف دی ڈیڈ" سے متاثر ہو کر تحریر کیا گیا ہے۔ ایک صاحب علم و ثروت شخص رشید اپنے بچپن کی دوست تنویر سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر تنویر شادی سے پہلے ہی مر جاتی ہے۔ دل برداشتہ ہو کر رشید تصوف میں پناہ لیتا ہے اور تنویر کی قبر کے علاوہ قبرستان کا مجاور بن جاتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات سکینہ سے ہو جاتی ہے جس کی خوبصورتی اس پر اثر کرتی ہے اور سکینہ کو دیکھ کر اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت چھا جاتی ہے۔ رشید کی موت کے ساتھ ہی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ مجنوں صاحب نے اس کہانی کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ انسانی پریشانیوں اور افسردگی کا حل صرف محبت میں مضمر ہے۔

مندرجہ بالا افسانوی مجموعوں کے علاوہ مجنوں صاحب نے قسط وار طویل افسانے یا ناولٹ بھی تحریر کیے ہیں جو بہت مقبول ہوئے۔

سوگوار شباب

۱۳۶ صفحات پر مشتمل یہ ناولٹ ۱۹۳۱ء میں 'ایوان' گورکھپور میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد ایوان اشاعت گھر نے اسے ۱۹۴۱ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ مجنوں صاحب نے ہارڈی کے ناول "ٹاؤن آن اے ٹاور" سے متاثر ہو کر تحریر کیا۔ جس کا ہندی زبان میں 'کنور کوٹ' کے نام

سے فراق گورکھپوری نے ترجمہ کیا۔

سائرہ کنورکوٹ کے مالک حاتم کی منکوحہ ہے۔ تین سال بعد حاتم اپنے مزاج کے مطابق سائرہ کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جاتا ہے۔ ادھر سائرہ کنورکوٹ مشتاق کو کرائے پر دے دیتی ہے اور یوں اس کا ایک سلسلۂ تعلقات مشتاق کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے جو معاملہ بندی تک بڑھ جاتا ہے۔ اس دوران مشتاق اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ جاتا ہے جہاں اسے حاتم کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے۔ سائرہ نعیم سے شادی کر کے ایک بیٹی کی ماں بن جاتی ہے۔ مشتاق جب علی گڑھ سے آتا ہے تو اسے دیکھ کر سائرہ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

سماج میں رونما ہونے والے واقعات پر مبنی اس کہانی میں کرداروں کو حقیقی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ مجنوں صاحب کی ہر کہانی کی ہیروئن حسن و جمال کا مرقع ہوتی ہے، جس سے وہ اپنے قارئین کی توجہ کہانی کی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ حسن انسان کی کمزوری ہے۔ کہانی کے مکالمے جاندار ہیں اور خصوصاً حسن و جنس کے متعلق۔ جس سے نسائیت پر مجنوں صاحب کے مطالعہ کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔

گردش

یہ ناولٹ بھی ہارڈی کے ایک اور ناول ''دی میئر آف کاسٹر برج'' سے متاثر ہو کر تحریر کیا گیا۔ کتابی صورت میں 'گردش' کے نام سے شائع ہونے سے پہلے یہ 'ایوان' گورکھپور میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ مگر 'قسمت کا پانسہ' کے نام سے جو مگھر گاؤں کے جولاہے حیدر کے بارے میں ہے جس نے ایک طلاق یافتہ عورت فاطمہ کو کلکتہ لے جا کر شادی کر لی تھی جسے اس کے شوہر اختر نے نشے کی حالت میں طلاق دی تھی۔ نشہ اترنے پر اسے فاطمہ کی جدائی کا افسوس ہوتا ہے۔ وہ زمیندار کے پاس نوکر ہو جاتا ہے۔ قسمت یاوری کرتی ہے اور اسے نجی کاروبار میں ایسا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ رئیس ہو جاتا ہے۔ فاطمہ واپس آ کر اختر کے ساتھ رہنے لگتی ہے اور مر جاتی ہے۔ اختر کی خودکشی

کے ساتھ ہی کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔

کہانی میں گو کہ بہت سے موڑ آتے ہیں مگر قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہی کہانی کا حسن ہے اور مجنوں صاحب کی بحیثیت ایک بڑے افسانہ نگار کامیابی بھی۔

صید زبوں

۱۴۰ صفحات پر مشتمل یہ ناولٹ نومبر ۱۹۴۴ء میں ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے یہ 'من در چہ خیالم۔۔۔' کے عنوان سے 'نگار' میں جولائی تا اکتوبر ۱۹۲۸ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہو چکا تھا اور قارئین میں مقبول ہوا۔ حقیقتاً یہ ہارڈی کے ناول ''وو ڈ لینڈرز'' سے ماخوذ ہے۔

اس افسانے میں بھی مجنوں صاحب نے محبت کی عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ جو ذات پات اور دین دھرم کے اختلافات سے مُبرّا ہوتی ہے۔ اسی لیے احمد اور مالتی اپنی محبت کے درمیان مذہب کی رکاوٹ کو نہیں آنے دیتے۔ دوسری طرف مادیت اور ہوس پرستی معاشرے کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کا کردار اس کی بہترین مثال ہے جو ظاہری طور پر تو خدمت خلق میں مصروف رہتا ہے لیکن اندرونی طور پر خباثت کا مجسمہ ہے۔

مکالمہ نگاری مجنوں صاحب کی افسانہ نویسی کی اہم خصوصیت ہے اور ان کے افسانوں کی کامیابی کی ذمہ دار بھی اور جس سے ان کی افسانہ نگاری کے شعور کی پہچان ہوتی ہے۔ ان کے تحریر کردہ ایسے ہی طویل و مختصر افسانوں نے فکشن کی دنیا میں ان کی افسانہ نگاری اور شخصیت کو مستحکم کیا ہے۔

سرنوشت

روسی ناول نگار تورگنیف کی تخلیق ''فضول آدمی کا روزنامچہ'' سے متاثر ہو کر تحریر کردہ ناولٹ ہے جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن سے دسمبر ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس

سے پہلے یہ ۱۹۳۲ء میں ''ایک نکمے کی سرگزشت'' کے عنوان سے مجلہ 'ایوان' میں قسط وار شائع ہو چکا ہے اور روزنامچہ کی شکل میں ہے۔

کہانی یوں ہے کہ دھان پان شخصیت کا حامل مظہر ایک شادی شدہ خاتون (روشن) سے محبت کرتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے الہ آباد جانے سے قبل وہ حادثاتی طور پر سلطانہ سے شادی کر لیتا ہے اور بیماری سے نجات کے لیے تفریحی مقام لکشمی پور چلا جاتا ہے۔ مختصر عرصے کے بعد واپسی پر سلطانہ کو رفیق کی آغوش میں دیکھ کر وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس دوران وہ روشن کو خط کے ذریعے اپنی متوقع موت کی خبر دیتا ہے اور پھر وقت مقررہ پر مر جاتا ہے۔ روشن خبر سن کر آتی ہے تو مظہر کا روزنامچہ ''نکمے کی سرگزشت'' پڑھتی ہے جسے وہ شائع کرا دیتی ہے۔

کسی حد تک یہ مجنوں صاحب کی آپ بیتی ہے جس میں مہدی افادی کی بیٹی ناہید سے ان کی انسیت کی کہانی بہ الفاظ دیگر لکھی گئی ہے۔ رتن ناتھ کا کردار مجنوں صاحب کے دوست فراق گورکھپوری سے مماثلت رکھتا ہے۔ مختصراً روزنامچہ کی شکل میں تحریر کردہ مجنوں صاحب کا یہ منفرد افسانہ یا ناولٹ ہے۔

سراب

۱۹۴۵ء میں ادارہ اشاعتِ اردو، حیدر آباد دکن سے شائع ہونے والے ۲۸۳ صفحات پر مشتمل اس ناولٹ میں مجنوں صاحب کے دو طویل افسانے 'سراب' اور 'بازگشت' شامل ہیں۔ 'سراب' خطوط پر مشتمل مجنوں صاحب کا کامیاب ترقی پسند افسانہ ہے جس میں انہوں نے زمینداری نظام کے خلاف کھل کر بات کی ہے اور نسرین کے محبت بھرے خطوط کے جواب میں انہوں نے اسے یوں تحریر کیا ہے:

> ''پہلے میری زندگی کا نصب العین تم کو اور صرف تم کو چاہنا تھا۔ اب میری زندگی کا نصب العین حق پرستی، اخوت، انسانیت کا پیغام دو اور جہاں کہیں

بھی دکھ پاؤ، اس کو مٹا دینا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے خود کو مٹ جانا پڑے۔''

مجنوں صاحب کے اس خواب سے ان کی ترقی پسند فکر کا اظہار ہوتا ہے۔ خطوط کے ذریعے نسرین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی شادی دولت کی وجہ سے ایک بوڑھے کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔ جنسی طلب کی تکمیل کے لیے جب وہ اپنے سوتیلے بیٹے قاسم سے دل لگاتی ہے تو طلاق کی حقدار بن جاتی ہے۔ وہ یوسف کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے مگر یوسف نے جس مقصد کے لیے اپنے کو وقف کر رکھا تھا وہ اسے اس طرح وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

سرلا اس میں جذبۂ محبت کو بیدار کرتی ہے لیکن سماج ان کی شادی کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے اور وہ واپس اپنی زمینوں پر چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات الگو چمار کی بیٹی چمپا سے ہوتی ہے۔ نسرین مر جاتی ہے اور سرلا کی شادی کسی دوسرے چمار سے کر دی جاتی ہے۔ سرلا کے خط سے اطلاع پا کر یوسف اپنی زمین چمپا کے نام اور اپنی کتب وافسانہ ''انقلابی کی سرگزشت'' سرلا کے نام کر دیتا ہے اور یوں کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

ناولٹ 'سراب' میں شامل دوسرا افسانہ 'بازگشت' بھی ہارڈی کے ناول 'قدرت کی واپسی' سے متاثر ہو کر تحریر کیا گیا ہے جو ۱۹۲۹ء کے نگار میں 'محبت کی فریب کاریاں' کے عنوان سے قسط وار شائع ہو چکا تھا اور قارئین سے مقبولیت کی داد حاصل کر چکا تھا۔

مریم، ادریس سے شادی کر لیتی ہے لیکن عشق کی یہ شادی چند دن ہی چلتی ہے اور وہ رؤف کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ ادریس ان کا پیچھا کرتا ہے مگر وہ دونوں ندی میں ڈوب کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی معاشروں کے پس منظر میں تخلیق کردہ یہ ناولٹ ہندوستانی تہذیب وثقافت کا آئینہ دار ہے جو مجنوں صاحب کے وطن مالوف گورکھپور کے پس منظر میں بہت خوبصورتی سے

تحریر کیا گیا ہے۔ ادریس اور رؤف کے مخالف کرداروں کے ساتھ ہی مریم کا تعلیم یافتہ اور آزاد خیال کردار برصغیر کی معاشرت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

زیدی کا حشر

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے، 'زیدی کا حشر' مجنوں گورکھپوری کا اولین طویل افسانہ ہے۔ جو جمیلہ بیگم کے دیے گئے چیلنج کے طور پر 'شہاب کی سرگزشت' کے طرز پر ۱۹۲۵ء کے نگار میں قسط وار شائع ہوا لیکن ۱۴۰ صفحات پر مشتمل کتابی صورت میں بہت بعد میں یعنی مارچ ۱۹۴۶ء میں سی پی اردو اکیڈمی ناگپور نے شائع کیا۔

زیدی اور حسنین دو دوست ہیں، جن کی رومانیت کے مختلف انداز ہیں۔ زیدی کو اپنی منزل مقصود صوفیہ کی صورت میں مل جاتی ہے مگر اپنی فلسفیانہ فکر کے زیر اثر وہ اس طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا اور صوفیہ کی شادی حسنین سے ہو جاتی ہے تاہم وہ حسنین سے بیزار ہو کر مر جاتی ہے اور زیدی اس خبر سے پاگل ہو جاتا ہے۔ یہی افسانے کا اختتام ہے۔

مجنوں صاحب نے یہ افسانہ صرف 'شہاب کی سرگزشت' کے مقابلے میں لکھا تھا۔ اس لیے کہانی اسی افسانے کی طرح بے مقصد اور بے معنی ہے۔ جس کا اعتراف خود مجنوں گورکھپوری نے بھی کیا ہے۔ ان کا یہ اعتراف ارمغانِ مجنوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ تو اس طویل افسانے یا ناولٹ کی دوبارہ اشاعت سے متفق نہ تھے مگر پبلشر نے اصرار کر کے اسے شائع کر دیا۔ بہر حال یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا کہ ان کے تخلیقی ذہن کا پہلا نقش یادگار کے طور پر محفوظ رہ گیا۔ اس سے محققین کو انہیں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مجنوں کی ترجمہ نگاری

ترجمہ قوموں کے عروج وزوال اور ان کی تہذیبی اقدار کی جان کاری میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے اور ایک دوسرے سے علم وحکمت اور صنعت وحرفت سیکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمے کے ذریعے دنیا کی اعلیٰ درجے کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر یہی ترجمے تصنیف وتالیف کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سمجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف وتالیف سے زیادہ قابلِ قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔'' (۸)

مجنوں گورکھپوری جنہیں علم وفکر اور زبان وبیان کی خوبیاں اپنے والد مولوی محمد فاروق دیوانہ سے ورثے میں ملی تھیں، مغربی ادب میں دلچسپی لینے لگے اور انگریزی زبان پر اپنے عبور کی وجہ سے ترجمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی اس خصوصیت کے بارے میں ان کے دوست فراق گورکھپوری نے تحریر کیا:

> ''مجنوں صاحب میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں، وہاں ایک غیر معمولی صلاحیت یہ بھی تھی کہ وہ انگریزی الفاظ اور انگریزی فقروں کا نہایت برجستہ اور صحیح ترجمہ کر سکتے تھے۔ اس وقت مجنوں کی عمر صرف انیس برس

ہوگی اور میں اس امر کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ انیس برس کا لڑکا انگریزی
شاعری، انگریزی نثر، سائنس، فلسفہ، جمالیات اور دیگر علوم کی انگریزی
اصطلاحوں کا اتنا تیر بہدف ترجمہ کردے کہ آنکھیں کھلی رہ جائیں۔" (۹)

مجنوں صاحب جب کرسچین کالج، الہ آباد میں زیر تعلیم تھے اور فراق صاحب کے ساتھ رہ رہے تھے تب ہی انہیں آسکر وائلڈ کا مشہور ڈرامہ سالومی پڑھنے کو ملا جس کا ترجمہ انہوں نے ایک ہفتہ میں کرڈلا۔

سالومی

۸۳ صفحات پر مشتمل آسکر وائلڈ کے مذہبی ڈرامے سالومی کا ترجمہ مجنوں صاحب نے ۲۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کو مکمل کرلیا اور اسے پرنٹر سید انعام مصطفےٰ نے اسٹار الیکٹرک پرنٹنگ ورکس، الہ آباد سے شائع کیا۔

مجنوں صاحب تمہید میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ کہنا غلط ہے کہ سالومی ایکٹریس سارہ برن ہارٹ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ یہ بات آسکر وائلڈ نے اپنے ایک خط میں تحریر کرکے چھپوادی تھی۔ اسے آسکر وائلڈ نے ۹۲۔۱۸۹۱ء میں بمقام ٹار کی تخلیق کیا۔ سنڈرمین کا ڈرامہ 'یوحنا' ۱۸۹۸ء سے قبل شائع نہیں ہوا اس لیے اس کا تعلق اس ڈرامے سے بھی نہیں ہوسکتا۔

سالومی کے ترجمے جرمن، انگریزی، اطالوی، اسپینی، روسی، پولش، زک، ڈچ، اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ہوچکے ہیں چنانچہ مجنوں صاحب نے اردو میں اسکا ترجمہ کرنے کی ہمت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ آسکر وائلڈ کی جدت طرازیوں کو اردو جیسی کم مایہ زبان میں اس حسن اسلوبی کے ساتھ ادا کیا کرنا کوہ کنی سے کم نہ تھا۔ مگر مجنوں صاحب نے یہ گراں پتھر اٹھالیا اور عام فہم زبان میں سالومی کو اردو کے قارئین تک پہنچا دیا۔

قصہ یوں ہے کہ بادشاہ ہرودیس نے اپنی بھاوج ہرودیہ سے بالجبر نکاح کر کے اسے اپنی ملکہ بنا لیا جو ایک گناہ تھا۔ سالومی جو ہرودیہ کی بیٹی ہے، خوبصورت اور ماہر رقاصہ ہے، وہ ایک نیک شخص یوحنا (جسے نبی بتایا گیا ہے) سے محبت کرتی ہے۔ یوحنا ہرودیہ کو بُرا کہتا ہے اسی لیے وہ سالومی سے بھی خوش نہیں۔ سالومی ہرودیس کی فرمائش پر اس شرط کے ساتھ رقص کے لیے تیار ہو جاتی ہے کہ اسے یوحنا کا سر دیا جائے۔ اس کی شرط کے مطابق رقص کے بعد سر دیا جاتا ہے جسے چوم کر وہ اپنی حسرت پوری کر لیتی ہے لیکن ہرودیس کے آدمی اسے قتل کر دیتے ہیں۔ اس طرح اردو ادب کے قارئین سالومی سے روشناس ہوتے ہیں اور مجنوں گورکھپوری کی ترجمہ نگاری سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔

'آغاز ھستی' اور 'دی ژون'

مجنوں گورکھپوری نے برنارڈ شاہ کے ڈرامے 'بیک ٹو میتھو سلا' کا ترجمہ 'آغاز ہستی' کے نام سے کیا جو نگار جنوری و فروری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ ان دو اقساط کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا جس کی وجہ شا کی اسلام دشمنی اور عریانیت تھی۔ بہر حال برطانیہ کے معروف ادیب اور انگریزی ڈراموں کے اہم خالق برنارڈ شا کی تخلیق کو اردو کے قارئین سے روشناس کرانے کا سہرا تو ان کے سر باندھا ہی جائے گا۔

۱۹۳۲ء میں برنارڈ شا کے دوسرے ڈرامے سینٹ جان کا ترجمہ انہوں نے 'دی ژون' کے نام سے شروع کیا لیکن اس میں بھی اس کی اسلام دشمنی کی وجہ سے مجنوں صاحب کو اس کا سلسلہ بند کرنا پڑا۔

قابیل

۱۹۸ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ لارڈ بائرن کے ڈرامے 'کین' کا ہے جو ۱۹۳۲ء میں 'ایوان'

گورکھپور سے 'قابیل' کے نام سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے ۱۹۳۰ء میں یہ قسط وار مجلّہ 'ایوان' میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ ڈرامہ حضرت آدمؑ کے بیٹے ہابیل کے قتل پر مبنی ہے۔ گو کہ یہ ترجمہ مجنوں صاحب کی ابتدائی کاوشوں میں سے ہے مگر انہیں اولیت کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔

سنگھاسن بتیسی

۱۹۲صفحات پر مبنی فارسی زبان سے کیا گیا یہ ترجمہ ۱۹۴۱ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا۔ 'سنگھاسن بتیسی' ہندو دیومالائی قصوں پر مشتمل ہے۔ قصہ یوں ہے کہ اُجین کے راجہ بھوج کو کھدائی کے دوران راجہ وکرماجیت گپت کا وہ تخت مل گیا جسے بتیس پُتلیاں اٹھائے ہوئی تھیں۔ وہ بولنے کے علاوہ علوم وفنون کے تمام اسرار ورموز سے واقف تھیں۔ راجہ بھوج نے جب اس تخت پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو تمام پُتلیاں اس کو اس ارادے سے باز رکھنے کے لیے ہر روز ایک کہانی سناتی ہیں۔ راجہ بھوج کہانی میں مصروف ہو کر تخت پر بیٹھنے کا ارادہ اگلے روز کے لیے ملتوی کر دیتا ہے۔ اس طرح بتیس پُتلیوں کی سنائی ہوئی کہانیوں کے اس مجموعے کو سنگھاسن بتیسی کا نام دیا گیا۔

ابوالخمر

۴۰صفحات پر مشتمل ٹالسٹائی کے ڈرامے 'دی فرسٹ ڈسٹلر' کا ترجمہ مجنوں گورکھپوری نے 'ابوالخمر' کے عنوان سے شائع کیا جسے انوار بکڈپو، لکھنو نے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ اس سے پہلے دسمبر ۱۹۲۷ء میں یہ نگار میں شائع ہو چکا تھا۔ مجنوں صاحب ٹالسٹائی کی انقلاب آفریں تحریروں سے متاثر تھے اور اس ڈرامے میں انہیں فضا ہندوستان کی سی محسوس ہوئی۔

کہانی مختصراً یوں ہے کہ شیطان انسان کو اپنا غلام بنانے کے لیے بہانے سے شراب کا عادی بنا دیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ یونہی اگر شراب پیتے رہے تو میری غلامی بھی کرتے رہیں گے۔

مریم مجدلانی

۷۸ اصفحات پر مشتمل مجنوں صاحب کا ترجمہ کردہ بلجیئم کے نوبل انعام یافتہ ادیب مارس ماٹر لنگ کا یہ ڈرامہ کتابی صورت میں ایوان گورکھپور سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ جب کہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۳۴ء میں یہ ایوان گورکھپور میں قسط وار شائع ہو چکا تھا۔

اس ڈرامے کی کہانی بائبل سے ماخوذ ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے معجزے، حضرت مریم کی ان سے محبت اور لوگوں کے ظلم و ستم کو ڈرامے کے روپ میں ڈھالا گیا ہے۔

ناصری نئے دین کا پرچار کرتا ہے۔ وہ جذام کے مریضوں کو شفایاب کرتا ہے۔ مریم ناصری کی تعلیم سے متاثر ہو کر اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ رومی ناصری کو یہودیوں کا مذہبی رہنما ہونے پر قید کر لیتے ہیں۔ رومی بادشاہ ویروس کو ناصری کے فیصلے کا اختیار دے دیتا ہے۔ مریم ویروس سے ناصری کی رہائی کی درخواست کرتی ہے جو صرف ایک بوسے کے عوض ناصری کو رہائی کی شرط رکھتا ہے۔ مگر مریم اس شرط کو ٹھکرا دیتی ہے اور ناصری کو مار دیا جاتا ہے۔ اس طرح افسانہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

کنگ لیئر

ساہتیہ اکیڈمی، دہلی کی فرمائش پر مجنوں گورکھپوری نے ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے کنگ لیئر کا ترجمہ کیا۔ جسے اکیڈمی نے کتابی صورت میں ۱۷۲ صفحات پر شائع کیا۔

کہانی یوں ہے کہ برطانیہ کا بادشاہ لیئر اپنی جائیداد کی تقسیم کے لیے اپنے تینوں بیٹیوں کی محبت کا امتحان لیتا ہے۔ ایک بیٹی جسے اپنے باپ سے محبت ہے مگر محبت کے اظہار سے وہ قاصر ہے۔ بادشاہ اس سے خفا ہو کر عاق کر دیتا ہے۔ وہ دوسری دو بیٹیوں کی لفاظی سے متاثر ہو کر جائیداد ان

میں تقسیم کر دیتا ہے۔ مگر دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے ظالمانہ سلوک کرتی ہیں۔ جس بیٹی کو اس نے عاق کیا تھا اسے شاہ فرانس ملکہ بنا کر لے جاتا ہے۔ آخر میں لیئر اور اس کی دونوں بیٹیوں کے مرنے کے ساتھ ہی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

شمسون مبارز

۱۳۹ صفحات پر مشتمل جان ملٹن کے المیہ ڈرامے شمسون مبارز کا ترجمہ کتابی صورت میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ جب کہ اس کی کچھ قسطیں ۱۹۶۶ء میں ماہنامہ 'آج کل' دہلی میں شائع ہو چکی تھیں۔ شمسون کا قصہ مسلم روایات، انجیل اور اسرائیلی روایات میں ملتا ہے۔

یہودی شمسون مخالفتوں کے باوجود ایک فلسطینی عورت سے شادی کر لیتا ہے۔ مگر اس سے ناراض ہو کر اس کے والدین کے گھر بھیج دیتا ہے اور فلسطینیوں کے کھلیانوں کو جلا دیتا ہے۔ آخر کار اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ مگر وہ اپنی جبروتی طاقت سے رہا ہو جاتا ہے۔ اس کی محبوبہ طاقت کا راز پا کر اس کے بال کاٹ کر اسے بے بس کر دیتی ہے۔ فلسطینی اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیتے ہیں۔ یہودی اسے بڑے معبد کے جشن میں نچاتے ہیں اور اسے ستون کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔ وہ اپنی پرانی طاقت کی واپسی کی دعا کرتا ہے۔ زور لگانے سے ستون ہل جاتے ہیں اور ایوان کی چھت گرنے سے تین ہزار فلسطینی مرد اور عورت ہلاک ہو جاتے ہیں۔ شمسون بھی مر جاتا ہے اور ڈرامے کا اختتام ہو جاتا ہے۔ مجنوں صاحب کے مختلف تراجم سے اردو ادب کو یورپی مفکروں کی سوچ اور ان کے ادب سے آگاہی سے حاصل ہوئی۔

فلسفہ، تحقیق وتنقید

مجنوں گورکھپوری کا مزاج لڑکپن سے فلسفیانہ اور ناقدانہ رہا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں صفحوں کے صفحے کائنات اور انسانی زندگی کی فلسفیانہ بحث سے بھر دیتے تھے جس کو ان کے قارئین برداشت بھی کرتے رہے ہیں۔ ایک اور بات جو انہوں نے اپنی خودنوشت میں بتائی ہے، وہ یہ ہے کہ جب وہ کسی کے بارے میں سنتے تھے کہ وہ شاعر ہے تو ان میں تجسس پیدا ہوتا تھا کہ اس شخص کی شاعری اور شخصیت میں کوئی مطابقت ہے یا نہیں۔ اگر کوئی شاعر اپنی شعر گوئی کے ساتھ زندگی کے اہم مسائل پر غور وفکر یا تبادلۂ خیال نہیں کر سکتا تو وہ اس سے کچھ زیادہ قائل نہیں ہوتے تھے۔ فکشن رائیٹرز کو بھی وہ اسی معیار پر پرکھتے تھے۔ مثنوی 'زہر عشق' پر تحریر کردہ اپنے مضمون کو وہ اپنی پہلی ادبی تنقید قرار دیتے ہیں۔ جس میں انہوں نے نواب مرزا شوق کی مثنوی 'زہر عشق' کا تقابل اثر کے اعتبار سے گوئٹے کی تصنیف 'آلام ورتھر' سے کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ دونوں ایک پائے کی چیزیں ہیں۔ دونوں کے پڑھنے سے کم از کم وقتی طور پر انسان زندگی اور موت کی تفریق بھول جاتا ہے۔ موت کا ڈر اس کے دل سے نکل جاتا ہے بلکہ اس میں مرنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دونوں تصانیف میں صرف ایک ہی مطابقت ہے کہ دونوں میں مرکزی کردار کا انجام خودکشی پر ہوتا ہے۔ زہر عشق پر اپنے مقدمے کو مجنوں صاحب نے تاثراتی یا ارتسامی تنقید کا نام دیا ہے اور اسے تقابلی تنقید سے قریب تر بتایا ہے۔

خواجہ میر درؔد کے بھائی میر آثر کی مثنوی 'خواب وخیال' پر مجنوں صاحب کا تحریر کردہ تفصیلی مضمون ان کا دوسرا تنقیدی مضمون ہے جس کو انہوں نے تجزیاتی یا تشخیصی تنقید کا نام دیا ہے، جس میں کسی

فنکار کی کسی تخلیق کا تجزیہ کر کے اس کی اصل شخصیت و طبیعت کا تعین کیا جاتا ہے۔ یعنی 'خواب و خیال' کے توسط سے میر اثر کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ ایک اور تنقیدی مضمون مولانا غنیمت کنجاہی کی فارسی مثنوی 'نیرنگ عشق' پر بھی مجنوں صاحب تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ خطوط کی شکل میں تنقید کی یہ پہلی مثال ہے اور محبت خان محبت کی مثنوی 'اسرار محبت' کا تنقیدی تجزیہ بھی مجنوں صاحب کی اہم کاوش ہے۔

مجنوں صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ 'تاریخ جمالیات' ہے۔ فنون لطیفہ کی ماہئیت پر ۱۹۳۱ء میں 'ایوان' میں قسط وار شائع ہونے والا یہ طویل مقالہ بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو کر اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت مقبول ہوا اور جامعات میں ایم اے کے نصاب میں ہنوز شامل ہے۔

'پردیسی کے خطوط' جس کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے، مجنوں صاحب کی ایک اہم اور منفرد تخلیق ہے جس کے موجد بھی وہ خود ہیں اور خاتم بھی۔ انہوں نے ان خطوط میں افسانوی چاشنی کے ساتھ ادب اور زندگی کے فکری عنوانات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ تمام خطوط ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء تک کے عرصے میں تحریر کیے گئے ہیں۔

مجنوں صاحب نے تو اپنی نظریاتی تنقید کی ابتدا ۱۹۳۶ء سے بتائی ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کے مطابق ان کا 'نگار' میں شائع ہونے والا پہلا تنقیدی مضمون 'زندگی' کے عنوان سے ہے جو دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون 'مجنوں گورکھپوری اور نیاز و نگار' مشمولہ 'ارمغان مجنوں' (جلد دوم) میں یوں قمطراز ہیں:

> ''وہ (مجنوں صاحب) نظریاتی تنقید کی جانب ۱۹۳۶ء سے بہت پہلے بلکہ عملی تنقید یعنی میر اثر، نواب مرزا شوق کی مثنوی پر قلم اٹھانے سے بھی پہلے ۱۹۲۹ء میں متوجہ ہوئے۔ ان کا ایک مضمون 'زندگی' کے عنوان سے دسمبر ۱۹۲۹ء کے نگار میں نظر آتا ہے، یہ مضمون ادبی تنقید کے سفر میں مجنوں کے جمالیاتی وافادی اور جدلیاتی ورجائی نقطۂ نظر کی اساس ہے۔ زندگی کیا

ہے، غم اور خوشی یا بیم و رجا سے اس کا کس نوع کا تعلق ہے۔ دنیا کے بعض عظیم ادیبوں اور فلسفیوں نے اسے کن کن زاویوں سے دیکھا ہے۔ زندگی اور ادب کا باہم کیا رشتہ ہے یا اسے کیا ہونا چاہیے۔ تصوّف اور فلسفہ نے معاشرے کو کیا دیا ہے۔ شاعر یا شاعری کے عطیات کس نوع کے ہیں۔ فردیت اور اجتماعیات کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے کیو ں کر مربوط رہ سکتے ہیں۔ زندگی کا سکون و اضطراب اصلاً کیا ہے۔ اس سے انسان کیونکر دوچار ہوتا ہے۔ رہبانیت اور بے عملی آدمی کو کیا دیتی ہے اور عمل و اقدام سے انسان کو کیا ملتا ہے۔ قنوطی اور رجائی میلانات کسی معاشرے یا فرد پر کس طرح اثرانداز ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں کا مجنوں صاحب نے اپنے مضمون میں بہت خوبصورت جائزہ لیا ہے۔"(۱۰)

ڈاکٹر عبدالستار نیازی نے اپنی تحقیق 'مجنوں گورکھپوری۔ حیات و فن' میں ہراقلیطس پر ان کے فلسفیانہ مضمون مطبوعہ 'نقیب، بدایوں' کو ان کا اولین مضمون قرار دیا ہے۔

شوپنھار

سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کی فلسفیانہ فکر کا جائزہ مجنوں گورکھپوری کی اردو میں پہلی فلسفیانہ تنقید کی کتاب 'شوپنہار' میں ملتا ہے جو جنون ۱۹۳۰ء میں ایوان اشاعت، گورکھپور سے شائع ہوئی۔ اس مختصر کتاب میں مجنوں صاحب نے شوپنہار کے فلسفۂ جمالیات، مابعد الطبیعات اور اخلاقیات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ نیاز فتح پوری نے 'نگار' ستمبر ۱۹۳۰ء میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

'یہ ایک رسالہ ہے جسے نگار کے مشہور افسانہ نویس مجنوں گورکھپوری نے

جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہار کے حالات اور اس کے فلسفے کی تنقید میں لکھا ہے۔ غالباً کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ مجنوں صاحب صرف افسانہ نگار نہیں بلکہ نہایت بلند فلسفیانہ ذوق بھی رکھتے ہیں اور یہ دونوں باتیں ان میں اس قدر حسن کے ساتھ ملی ہوئی ہیں کہ شوپنہار کی طرح ہم ان کے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان دونوں میں کون سا عنصر غالب پایا جاتا ہے۔ اس لیے شوپنہار کے فلسفے کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے مجنوں سے زیادہ اہل کوئی دوسرا شخص ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ فلسفے کے خشک مباحث پر انھوں نے کس قدر شگفتگی وادبیت سے گفتگو کی ہے۔‘‘(۱۱)

تاریخ جمالیات

مجنوں گورکھپوری کی دوسری فلسفیانہ پیشکش ان کی اہم کتاب ’’تاریخِ جمالیات‘‘ ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں ایوانِ اشاعت گورکھپور سے اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں انجمن ترقی اردو، علی گڑھ سے شائع ہوا۔ لغات میں Aesthetics کا ترجمہ جمالیات کیا گیا ہے جب کہ مناسب ترجمہ حسِ لطیف ہے۔ جمالیات میں حسن کے کوائف، مظاہر اور فنونِ لطیفہ دونوں شامل ہیں۔ مجنوں صاحب نے اس کتاب میں فلسفۂ یونان سے فلسفۂ مارکس تک تصور جمالیات کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

ماہنامہ ’قومی زبان‘ کراچی، جون ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والے اپنے مضمون ’مجنوں کی فلسفیانہ تحریریں‘ میں پروفیسر سحر انصاری تحریر کرتے ہیں کہ:

’’جمالیات پر لکھنے کے لیے فلسفیانہ ذہن، نفسیات سے دلچسپی، منطق سے فطری مناسبت، زندگی کا کامل سائنسی شعور اور مغربی ادب سے شناسائی ضروری ہے۔‘‘

مجنوں صاحب ابتدا میں سائنس کے طالب علم تھے اور سمن پوش کے توسط سے مابعد الطبعیات سے آشنا ہو چکے تھے، انہیں نفسیات سے گہری دلچسپی تھی اور وہ میاں صاحب جارج کالج، گورکھپور میں منطق کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے والد مولوی محمد فاروق دیوانہ کے توسط سے فلسفیانہ ذہن کی بناء پر زندگی کی بصیرت کا کامل شعور حاصل تھا اور مغربی ادب کا مطالعہ ان کا جنون بن چکا تھا۔ یہی تمام چیزیں جمالیات سے فطری مناسبت رکھتی ہیں۔ مجنوں صاحب نے تاریخِ جمالیات کا دائرہ حُسن اور فنونِ لطیفہ تک محدود کرتے ہوئے تحریر کیا کہ:

> ''جمالیات سے مراد باب فلسفہ کے وہ نظریے ہیں جو حسن اور اس کے کوائف مظاہر کی تخلیق و تشریح میں پیش کیے گئے ہیں۔''

ڈاکٹر انصار اللہ حسن کو جمالیات کی بنیاد بناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> ''اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ 'اللہ جمیل و یحب الجمال' یعنی اللہ خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ اس طرح مجنوں صاحب کی فکر درست راہ پر گامزن ہے۔''

برصغیر کی ادبی تاریخ کی ابتدا بھی 'سنگار رس' سے ہوتی ہے جو تمام تر حسن و جمال سے متعلق ہے اور رقص بھی ہندوی جمالیات کا بنیادی ستون ہے۔ مجنوں صاحب کثیر المطالعہ شخص تھے لہٰذا ان کی تاریخِ جمالیات، اس موضوع پر اردو اور انگریزی میں لکھی گئی کتابوں کا نچوڑ ہے اور ان کا بہت اہم کام ہے۔

افسانہ

۱۳۶ صفحات پر مشتمل مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی کتاب 'افسانہ' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں ایوانِ اشاعت، گورکھپور سے شائع ہوا۔ مجنوں صاحب نے جو خود بھی ایک معروف افسانہ نگار تھے، ۱۹۳۵ء میں انجمن اردوئے مُعلیٰ علی گڑھ کی درخواست پر افسانے کے فن اور اس کی غرض و

غایت کے متعلق کچھ لیکچر دیے تھے۔ انہیں کے پس منظر میں مجنوں صاحب کے دو طویل مضمون 'افسانہ اور اس کی غایت' اور 'اردو افسانہ' پر مشتمل یہ کتاب 'افسانہ' ۱۹۳۵ء تک کے فکشن اور اس کے فن کا احاطہ کرتی ہے اور شاید اردو میں فکشن کی اوّلین تنقید ہے، جس کی ضرورت پر ۱۹۲۷ء میں عبدالقادر سروری نے بھی اپنے ایک مضمون میں متوجہ کیا تھا۔ عبدالباقی اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''مجنوں نے مشرقی ادب کے پہلو بہ پہلو مغربی ادب کا مطالعہ بھی کیا۔ ان کی آنکھیں روشن ہی نہیں بلکہ گہری بھی تھیں۔ جس کے ذریعے وہ تنقید کی ہر راہ سے گزرے۔ اس مشاہدے نے انہیں ادب کا پختہ کار اور تجربہ کار جوہری بنادیا اور وہ ادب کے موتیوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ وہ تخلیق کے حسن وقبح اور مصنف کی خوبیوں اور خامیوں کو پوری طرح پرکھ لیتے ہیں۔''

کردار نگاری حقیقتاً افسانہ کی جان ہوتی ہے۔ اردو افسانہ میں کردار نگاری کے جھول کو محسوس کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے تحریر کیا کہ:

''اردو افسانہ کردار نگاری میں کوئی خاص مرتبہ حاصل نہ کر سکا۔ اردو افسانہ میں جو کچھ ہے وہ مغربی افسانہ کی دین ہے۔ ہاں! طبع زاد کردار نگاری میں سجاد حسین اور سرشار کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔''

کتاب کا دوسرا مضمون 'اردو افسانہ' بھی ۶ جنوری ۱۹۳۶ء کو اردو لٹریری سوسائٹی، کلکتہ میں پڑھا گیا ان کا ایک تجزیاتی مضمون ہے۔ جس میں انہوں نے ایک مخصوص علاقے کے ادب کو ہی اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ پھر بھی جدید افسانے کے فن پر ان کی یہ اولین تحریر آگے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام انجام دیتی ہے کہ کیوں کہ بقول آل احمد سرور اردو ناول پر اچھی کتابیں تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عبدالقادر سروری اور مجنوں گورکھپوری کی کتابوں کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں ملتا۔

ادب اور زندگی

نومبر ۱۹۴۰ء تک شائع ہونے والے تنقیدی مضامین پر مبنی ان کے دس مضامین کا مجموعہ 'ادب اور زندگی' پہلی بار ۱۹۴۰ء میں اور پھر ترمیم واضافے کے ساتھ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ جس کے پیش لفظ (گزارش) میں تحریر کیا گیا کہ ایک اچھے نقاد کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کی سب مجنوں میں موجود ہیں۔ مجنوں سمجھدار ہیں، وہ سوچ سکتے ہیں، وہ چیزوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ کسی چیز کو صرف سطحی نظر سے دیکھ کر کوئی رائے قائم نہیں کرتے بلکہ اس کے دل کو ٹٹولتے اور اس کی دھڑکنوں کا بغور تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ شاید ہی علوم کا کوئی شعبہ ہو جس کے متعلق وہ کافی معلومات نہ رکھتے ہوں۔ ادب، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، فلسفۂ نفسیات اور سائنس ان تمام علوم میں ان کو دخل ہے۔ ان تمام علوم کی روشنی ہی میں وہ ادب کو دیکھتے ہیں اور اس کی ساری خصوصیات کو اپنے جادو نگار کے قلم کے زور سے ہمارے سامنے بے نقاب کر دیتے ہیں۔

لوئی کزیمیاں نے اپنی مشہور کتاب 'تنقید تشکیلی مراحل میں' اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ صحیح معنوں میں نقاد وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے دماغ میں ہزاروں دماغوں کی صلاحیتیں یکجا ہوں۔ مجنوں پر یہ خیال صادق آتا ہے۔ ان کے دماغ میں ایک بڑے نقاد، ایک بڑے افسانہ نگار، ایک بڑے شاعر اور ادیب کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے سے دلچسپی رکھنے کے باعث اس کے مختلف مسائل پر بخوبی پر غور و خوض کر سکتے ہیں۔ ان کے بڑے ہونے کی ایک بڑی دلیل تو یہی ہے کہ وہ بیک وقت ایک کامیاب افسانہ نگار اور ایک کامیاب نقاد ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا ایک سنگم پر آنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ مجنوں کی تنقید میں گہرائی ہے، جان ہے اور پھر ساتھ ہی ساتھ ان کی تحریر کا ایک خاص انداز یعنی شگفتگی کے ساتھ ساتھ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت پڑھنے والے کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہے۔ وہ ان کی تنقید پڑھتے وقت اس میں کچھ کھوسا جاتا ہے۔

'ادب اور زندگی' نے جدید تنقید کے شعبے میں مجنوں کا ایک منفرد مقام متعین کردیا اور اس کتاب نے نوواردانِ ادب کو تنقید کی نئی راہوں سے روشناس کرایا اور ان راہوں پر ہمیشہ کے لیے ایک چراغ روشن کردیا۔ نیاز فتح پوری نے ان کی اہم کتاب 'ادب اور زندگی' پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا:

> ''مجنوں صاحب اپنے مطالعے کے لحاظ سے فلسفی بھی ہیں اور ادیب بھی۔ اس لیے دنوں کے امتزاج نے ان کے رنگِ انتقاد میں گہرائی کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور دلکشی بھی پیدا کردی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب وہ کسی ایسے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں جس میں انھیں فیوچرسٹ اسکول کے آرٹسٹ کی طرح خیال کا موقع مل جاتا ہے تو ان کے اشارات بہت پُرلطف اور گراں مایہ ہوجاتے ہیں۔'' (۱۲)

اس کتاب میں انہوں نے ادب، زندگی و ترقی اور اس کے بحرانی دور پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور نیا ادب کیا ہے؟ کا جواب دیا ہے۔ افسانے میں جدید میلانات، ناٹک اور تنقید کے علاوہ نظیر اور حالی کے اردو ادب میں مرتبے پر گفتگو کی ہے۔

اقبال: اجمالی جائزہ

اقبال (اجمالی تبصرہ) ۱۰۸ صفحات کی ایک مختصر کتاب ہے جسے ایوانِ اشاعت گورکھپور نے کب شائع کیا اس کا صحیح زمانہ تو اس لیے پتہ نہیں چلتا کیوں کہ اس پر تاریخِ اشاعت درج نہیں ہے مگر جیسا کہ مقالہ کے اختتام پر مجنوں صاحب نے تحریر کیا ہے کہ حقیقتاً بی اے (سال اول) کے طلبا کو لکھوائے گئے نوٹس ہیں جن کو انہوں نے کچھ پھیلا کر مربوط اور مرتب کردیا ہے۔ مجنوں صاحب بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور میں جو بعد میں گورکھپور یونیورسٹی ہوگیا، صدر شعبۂ اردو رہے ہیں۔ اور ان کی تنقید کی پہلی کتاب 'ادب اور زندگی' پہلی بار ۱۹۴۰ء میں ایوان اشاعت گورکھپور سے شائع ہوئی۔ لہٰذا اقبال پر تحریر کردہ اس

کتاب کا سن اشاعت ۱۹۴۴ء ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ۱۹۴۵ء میں اس کی ایک اور کتاب 'تنقیدی حاشیے' شائع ہوئی ہے۔ اس مقالے میں مجنوں گورکھپوری نے حضرت علامہ اقبال کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

''دنیا میں کبھی کبھی ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں جو نہ صرف اپنے زمانے کے میلانات کے تابع ہوتی ہیں بلکہ خود ان پر بھی قادر ہوتی ہیں اور ان کا رُخ نئی سمتوں میں موڑ بھی سکتی ہیں۔ اقبال کا شمار بھی ایسی ہی ہستیوں میں ہوگا۔ وہ یقیناً ایک ایسے صاحب بصیرت اور ایک ایسے دانائے راز تھے جن کی جگہ اردو شاعری میں ابھی کچھ عرصے تک کوئی لیتا نظر نہیں آتا۔ وہ بیک وقت اپنے زمانے کی مخلوق بھی تھے اور ایک نئے زمانے کے پروردگار بھی۔'' (۱۳)

مجنوں صاحب نے علامہ اقبال کو اردو کا پہلا ایسا شاعر مانا ہے جو مفکر بھی ہے اور صاحب پیغام بھی۔ ان کی شاعری آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بھی رکھتی ہے۔ انہوں نے ہمارے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کیا، ہمارے اندر ذوق سعی و عمل پیدا کیا اور ہمارے ذہنی میلانات کو ترقی کی نئی سمتوں میں لگایا۔ انہوں نے مشرقی اور مغربی ادب کے اثرات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمو لیا کہ دونوں مل کر ایک مہذب اور خوشگوار آہنگ بن گئے۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی خودی یا شخصیت کی تہذیب و تکمیل میں اپنی ساری قوت صرف کر دے کیوں کہ مستقبل میں بنی نوع انسان کی زندگی کی بقا اور ترقی اسی پر منحصر ہے۔

مجنوں صاحب نے آخر میں علامہ اقبال کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا:

''اقبال مجھے زندگی، انقلاب اور ترقی کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی اور بالیدگی کی جیسی شدید اور بھرپور قوت اقبال کی آواز میں محسوس ہوتی

ہے، نہ اُن سے پہلے کسی اردو شاعر کی آواز میں محسوس ہوتی ہے اور نہ ان کے بعد۔'' (۱۴)

اقبال پر مجنوں صاحب کی یہ کتاب دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ دراصل یہ اشارات ہیں جن پر تفصیل سے لکھا جاسکتا ہے۔

تنقیدی حاشیے

۳۲۰ صفحات پر مشتمل مجنوں صاحب کی تنقیدی کتاب 'تنقیدی حاشیے' کا پہلا ایڈیشن فروری ۱۹۴۵ء میں ادارۂ اشاعتِ اردو، حیدرآباد دکن نے شائع کیا۔ اس تنقیدی مجموعے میں گیارہ مضمون شامل ہیں۔

پہلا مضمون 'میر اور اُن کی شاعری' کے متعلق ہے۔ جن پر 'نکات مجنوں' کے ذیل میں گفتگو ہو چکی ہے کیوں کہ یہ مضمون اس مجموعے کی بھی زینت ہے۔

دوسرا مضمون قائم چاند پوری کے بارے میں ہے، جس کے بارے میں بھی مختصراً 'نکات مجنوں' کے تحت لکھا جاچکا ہے۔

تیسرا مضمون 'میر اثر خواب وخیال' ہے جس کے سلسلے میں تنقید و فلسفہ کے عنوان کے تحت مختصراً گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھا مضمون 'مسامحات تنقید' ہے جو وقار عظیم کے مضمون 'کلام اثر' کے اعتراضات کا جواب ہے۔ جنہوں نے یوں تحریر کیا ہے کہ اس وقت ہمارے پاس جتنے تذکرے ہیں ان میں نکات الشعراء مخزنِ نکات، چمنستانِ شعراء اور گلشنِ بے خار میں میر اثر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مجنوں صاحب کو وقار عظیم کے اس بیان پر حیرانی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت 'گلشن بیخار' مطبوعہ نولکشور کے صفحہ نمبر ۱۴ پر میر اثر کا نہ صرف ذکر ہے بلکہ ان کے کلام پر تبصرہ بھی ہے۔ وہ وقار عظیم کو مثنوی خواب وخیال کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔ وہ عبدالحئی تاباں اور ان کی شاعری کے تاثراتی

پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔

پانچواں مضمون مجنوں صاب کی تاثراتی تنقید ہے جو 'کلام بیدار' کے متعلق ہے۔ میر وسودا کے دور میں حضرت بیدار ایک معروف غزل گو تھے جنھوں نے روداد عشق کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ ان کے کلام میں سوز وگداز، درد واثر اور معنوی نزاکت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ بیدار ایک صاحب دیوان شاعر تھے۔

چھٹا مضمون 'مصحفی اور ان کی شاعری' کے متعلق ہے جو 'نگار' جنوری ۱۹۳۹ء میں شامل ہے اور 'نکات مجنوں' میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ جس میں اس پر مختصراً گفتگو کی جا چکی ہے۔

'مثنوی سحر البیان' کا ایک شعر کتاب کا ساتواں مضمون ہے۔ مجنوں صاحب نے میر حسن کے مندرجہ ذیل شعر پر کچھ اعتراضات کیے ہیں اور اسے ادب کی کسوٹی پر پرکھا ہے:

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

ان کا اعتراض تھا کہ دھان اور سرسوں چوں کہ مختلف موسموں میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے یکجا نہیں ہو سکتے۔ ان کا یہ اعتراض بجا ہے اور ان کی تنقیدی بصیرت کی نشاندہی کرتا ہے۔

'مثنوی اسرار محبت' کے متعلق مضمون کتاب کا آٹھوں مضمون ہے۔ یہ مضمون 'نکات مجنوں' میں بھی شامل کیا گیا ہے اور سہ ماہی 'اردو، اورنگ آباد' جولائی ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کا یہ مضمون مسعود حسن رضوی کے مضمون 'مثنوی اسرار محبت، مصنف نامعلوم' کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے۔ مجنوں صاحب نے تحقیق کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ مثنوی محبت خان محبت کی تصنیف کردہ ہے جسے شاید مسٹر جانسن کی فرمائش پر تحریر کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں 'جھنگ' کی رومانی داستان 'سسی پنوں' کو منظوم کیا گیا ہے۔

'غزلیات حالی' کتاب کا نواں مضمون ہے جس میں مجنوں صاحب نے حالی کی شاعری پر عمومی طور سے اور مسدس حالی پر خصوصی طور سے تنقیدی گفتگو کی ہے۔ مجنوں صاحب نے خواجہ الطاف

حسین حالی کی غزلیات کی بہت تعریف کی ہے اور ان کے تغزل میں غالب اور شیفتہ کے نمایاں اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ان کی اس رائے سے پروفیسر احتشام حسین نے بھی اتفاق کیا ہے اور اس بارے میں یوں تحریر کیا ہے کہ:

''غالب اور شیفتہ نے ان کو غزل گوئی میں ایک خاص حقیقت پسندانہ رنگ کا دلدادہ بنا دیا تھا۔''

'حضرت آسی کا تغزل' اس تنقیدی مجموعے کا دسواں مضمون ہے جو 'نکات مجنوں' میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ مجنوں صاحب نے حضرت آسی کی غزلوں میں ایک عجب حسن دیکھا تھا جس سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے جریدے 'ایوان' میں ان کا کلام بھی شائع کیا۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ تذکرہ نویسوں نے آسی کو نظر انداز کیا ورنہ ان کا کلام معیاری ہے۔ خود آسی کو بھی اپنی غزل کے معیاری ہونے کا احساس تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ایک شعر میں اس کا یوں اظہار کیا ہے:

اس قدر درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخن آسی شیدائے غزل میر نہ ہو

مجموعے کا آخری مضمون 'ریاض کی شاعری' کے متعلق ہے جو پہلی بار نگار جنوری ۱۹۴۳ء میں 'ریاض کی شوخ نگاریاں' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ریاض خیرآبادی کی شاعری کا موضوع 'حسن و عشق' اور 'رندانہ بے باکیاں' ہیں۔ اسی لیے انہیں خمریات کا شاعر بھی کہا گیا ہے۔ ان کی زبان کی سلاست اور محاوروں کا برمحل استعمال ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

نقوش و افکار

دس اہم تنقیدی مضامین پر مشتمل مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی کتاب 'نقوش و افکار' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل اس تنقیدی مجموعے میں جو مضامین شامل ہیں ان کے بارے میں مختصراً اظہار خیال پیش خدمت ہے:

'میر اور ہم' کے عنوان سے کتاب کا پہلا مضمون میر کی شخصیت اور فن پر مجنوں صاحب کا بصیرت افروز مضمون ہے۔ جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''میر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ یاس پرست ہیں اور ان کی شاعری پر قنوطیت چھائی ہوئی ہے۔ مجھے اس رائے سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ میر کو قنوطی سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی شاعری کا صرف سطحی مطالعہ کیا گیا ہے۔''

مجنوں صاحب میر تقی میر کو 'خدائے سخن' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہی ان کا میر کے لیے سب سے بڑا اخراجِ تحسین ہے۔

کتاب کا دوسرا مضمون 'مہدی حسن افادی الاقتصادی' کے متعلق ہے۔ مجنوں صاحب نے سب سے پہلے یہ مضمون میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور کے 'مہدی ڈے' پر پڑھا تھا جو 'شاہکار' گورکھپور کے جنوری ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

مہدی افادی مجنوں کے ماموں تھے اور ان کا تعلق بھی گورکھپور سے تھا۔ انہوں نے نثر میں اپنی اختراعات اور انشاپردازی سے بے مثل نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ ایک منفرد اسلوب رکھتے تھے۔

'ادب کی جدلیاتی ماہیت' کتاب کا تیسرا مضمون ہے جو پہلی بار 'نگار' فروری ۱۹۴۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''مجنوں نے اس مضمون کے ذریعے اردو خواں دنیا کو اس واقعہ کی اطلاع دی ہے کہ زندگی ایک جدلیاتی عمل ہے۔ اس میں تغیر اور ترقی کا قانون رائج ہے اور ترقی کے اس سفر کی منزل نوعِ انسانی کی مساوات ہے۔''

مجنوں صاحب نے دیگر قلمکاروں سے بھی ترقی پسند ادب کی تخلیق کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں جو ادب زندگی کے ساتھ ہوگا، وہ ایک ہی وقت میں ماضی کی یادگار، حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہوگا۔

چوتھا مضمون 'فانی بدایونی' کے بارے میں ہے۔ جو پہلی بار فروری ۱۹۵۰ء کے نگار میں شائع ہوا۔ مجنوں صاحب نے اپنے اس مضمون کے ذریعے فانی بدایونی کی شاعری کے پس منظر میں ان کے ادبی مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''ارباب نقد و نظر کی متفقہ رائے ہے کہ فانی قنوطی شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں ارضی زندگی کی کوئی بصیرت نہیں ہے۔ وہ ہمارے دنیوی وجود کو خیر و برکت کا وسیلہ نہیں سمجھتے۔ وہ زندگی کو سرتاسر فتنہ و فساد سے تعبیر کرتے ہیں:

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب دیوانے کا''

پانچواں مضمون 'حسرت موہانی' کے بارے میں ہے جو پہلی بار سہ ماہی 'اردو ادب' علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۵۰ء میں شاملِ اشاعت ہے۔ مجنوں صاحب نے اپنے اس مضمون میں حسرت کی شخصیت، سیاست اور مذہبیت کے بارے میں بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ حسرت ایک ذہین طالبعلم، خداداد صلاحیتوں کے مالک اور اشتراکی نظام کو پسند کرنے والے تھے۔ انہوں نے اردو شعرا کا جو انتخاب شائع کیا یہ ان کا اہم کارنامہ تھا۔ مجنوں صاحب کا یہ مضمون حسرت کے بارے میں عقیدت مندانہ حیثیت میں شمار کیا جائے گا۔

'حسرت کی غزل' کتاب کا چھٹا مضمون ہے جو پہلی بار 'نگار' جنوری رفروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنے اس مضمون میں حسرت کی غزل کے موضوعات اور اسلوب پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح مجنوں صاحب کا یہ مضمون حسرت کی غزل کا مجموعی جائزہ ہے۔

'نئی اور پرانی قدریں' کتاب کا ساتواں مضمون ہے جو اس سے پہلے 'ادب اور زندگی' میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنا یہ مضمون مارکس کے فلسفے اور اس کی جدلیت سے متاثر ہو کر تحریر کیا ہے۔ وہ ادیبوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ترقی پسند ادیب کا پہلا فرض ہے کہ وہ بصیرت اور قوت

انتخاب سے کام لے کر خوش آئند اور زندگی بخش روایتی تصورات اور اسالیب کو اپنی نئی تخلیقی اُپج میں جذب کرے کیونکہ انسانی زندگی میں اخلاقی تصادم، پیکار اور اندرونی نناقصات بڑھتے جا رہے ہیں۔

آٹھواں، نواں اور دسواں مضمون یعنی کلام بیدار، غزلیات حالی اور نظیر اکبر آبادی کے بارے میں پچھلے صفحات میں مختصراً گفتگو کی جا چکی ہے۔

نکاتِ مجنوں

'نکات مجنوں' سولہ مضامین پر مشتمل مجنوں صاحب کی وہ کتاب ہے جو اکتوبر ۱۹۵۷ء میں کتابستان الہ آباد سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب 'تنقیدی حاشیے' میں شامل تھے سوائے 'غزلیات حالی' اور 'کلام بیدار' کے جو ایک اور مجموعے 'نقوش وافکار' میں شامل کرنے کے لیے ہیں اور ان کی جگہ نیاز فتح پوری، عصمت چغتائی اور بزم احباب کے عنوان سے تحریر کردہ مضامین کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اپنے لکھنے کا جواز انہوں نے یہ دیا ہے کہ وہ لکھنے کے لیے مجبور ہیں کیوں کہ ان کی اٹھان ہی کچھ ایسی ہے کہ لکھنا پڑھنا ان کی زندگی کا ایک ضروری مشغلہ ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ شاید اس کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے۔

مجنوں صاحب نے قدیم شعراء میں سے صرف چند کو ہی تنقیدی اظہار کے لیے منتخب کیا۔ بقول رشید نثار:

> ''میر کو نفاست، نئی طہارت، نئی بالیدگی اور نئی شائستگی کے لیے منتخب کیا ہے۔ میر کے پاس کوئی دستور العمل نہیں اس کے باوصف پروفیسر صاحب نے میر کے کلام کو روح کی تربیت کے لیے لازمی قرار دیا ہے تاکہ مظالم اور تشدّدات کے خلاف قوت مدافعت پیدا کی جا سکے۔''

ڈاکٹر بجنوری کی اس رائے پر کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مجنوں صاحب نے یوں اظہار خیال کیا ہے:

> "یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرؔ کا کلام ہوتے ہوئے کسی شاعر کے کلام کو الہام کہنا زبردستی ہے۔ وہ محض شاعروں میں پیغمبر نہیں ہے (ان میں تو وہ خدا ہے) بلکہ واقعی پیغمبر ہے جو معاملات زندگی اور معاملات عشق میں ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔ وہ اس لحاظ سے پیغمبر ہے جس لحاظ سے اہلِ یونان اور اہلِ لاطین شاعر اور پیغمبر کے لیے الگ ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔" (۱۵)

مجنوں صاحب نے اس کتاب میں شامل اپنے مضمون میں صرف میر کی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے اور اس کا تجزیہ کیا ہے کہ میرؔ سے حزنیہ شاعری میں تخلیت اور رومانیت کے دور کی ابتدا ہوئی ہے۔ کلام میر میں رومانیت کی مثال دیکھے:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

یہ حقیقت ہے کہ مجنوں صاحب نے مروّجا طرز تحریر سے ہٹ کر میر کی شاعری کی جمالیاتی تہوں کو کھول کر ان کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس پر بھرپور گفتگو کی ہے۔ بقول خود ان کے انہوں نے پہلی مرتبہ کوشش کی ہے کہ میرؔ کی شخصیت اور ان کی شاعری کو ان کے زمانے، ماحول اور ان کے موثرات اور عوامل کی روشنی میں پیش کریں۔ ان کا یہ مضمون سب سے پہلے ان کے ادبی رسالے 'ایوان' میں جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اسے ان کے تنقیدی مجموعے 'نکات مجنوں' میں شامل کیا گیا، جو اکتوبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ یعنی بیس بائیس سال بعد بھی اس کی اہمیت میں کمی نہیں آئی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آج ساٹھ سال بعد بھی اس کی وہی اہمیت ہے اور آگے بھی رہے گی۔

قائم چاندپوری ان شعراء میں سے ہیں جن کو وہ پذیرائی نہیں ملی جو ان کا حق تھا۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے ان کے متعلق ایک طویل مضمون اس وقت تحریر کیا جس وقت تک قائم چاندپوری کا کوئی مجموعۂ کلام مختلف تذکروں سے جمع کیا، ان کے اشعار کے جمالیاتی مضمرات کا تجزیہ کیا اور ان کی شاعری کا مرتبہ متعین کیا۔ قائم کے بہت سے اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً

قسمت کو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

غیر اس کے کہ خوب روئیے اور
غمِ دل کا کوئی علاج نہیں

بھٹکا پھروں ہوں یاں جو اکیلا میں ہر طرف
اے ہمرہانِ پیش قدم تم کدھر گئے

'مصحفی اور ان کی شاعری' بھی مجنوں صاحب کا اپنی نوعیت کا اہم مضمون ہے۔ جس میں انہوں نے مصحفی کے مزاج شعری، لکھنؤ اور دہلی میں اس زمانے کے مزاج کی نوعیت اور مصحفی کے کلام پر اس کے اثرات پر گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ ان سب باتوں کے پیشِ نظر ان کا کلام کس حد تک معاصرین کے کلام سے مختلف ہے۔ اور اس میں بھی ضرب المثل بن جانے کی خوبی پائی جاتی ہے۔ مجنوں صاحب کے منتخب کردہ مصحفی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

میں عجب یہ رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

ریاض، آسی، نیاز اور عصمت چغتائی پر بھی ان کے مضامین کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ بزم احباب کے چار مضامین خطوط کی شکل میں تنقیدی مباحث پر مبنی ہیں۔ یہ بھی خطوط نگاری اور تنقید کا ایک منفرد انداز ہے جیسا کہ مجنوں صاحب نے خود تحریر کیا ہے، یہ مضامین ان کے پینتیس (۳۵) سالوں کی یادگار ہیں، جنہیں انہوں نے اپنے ہمدم دیرینہ حضرت نیاز فتح پوری کے نام معنون کیا ہے۔

شعروغزل

۲۰۲ صفحات پر مشتمل ۱۹۶۳ء میں ادبی اکیڈمی، کراچی سے شائع ہونے والی مجنوں گورکھپوری کی پاکستان میں پہلی تنقیدی کتاب 'شعروغزل' ہے، جو صرف چار طویل مضامین' شعروغزل'، 'غزل اور عصر جدید'، 'ادب اور ترقی کے علاوہ نیا ادب کیا ہے' پر مشتمل ہے۔

شعروغزل مجنوں صاحب کا وہ مضمون ہے جو سب سے پہلے جنوری ۱۹۵۷ء کے نگار میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس مضمون میں فنونِ لطیفہ کی تاریخ، شاعری کی ابتدا، مشرقی ومغربی مفکرین کے اقوال، غزل کا پس منظر اور موضوعات، غزل کی زبان کے اصول اور مختلف شعراء کے کلام میں علم عروض کی کمی پر گفتگو کی گئی ہے۔

شاعری کے بارے میں ان کی تحقیقی گفتگو سنیے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

شاعری کی قدیم ترین مثالیں بھجن، وید کے اشلوک، اوستا کے فرگرو، کنفیوشس کے ملفوظات الہامی، اشعار موسوی کی تنبیہیں اور ہدایتیں، زبور کی مناجاتیں، سلیمان بن داؤد کے امثال اور گیت، انجیل کی شہادتیں، سولن کے قوانین اور یونانی حکما شاعری کا لباس پہن کر ہی ظاہر ہوئے۔"

ان کے نزدیک تخیل کی داخلی تحریک کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ مجنوں صاحب مارکسیت کے تناظر میں جدلیات کو زندگی اور نظام کائنات کی روح تصور کرتے ہیں۔ فنکار بننے کے لیے وہ ماضی سے اکتساب کو ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک غزل کا معیاری شعر وہ ہے جو حافظے پر بے ساختہ چڑھ جائے بلکہ زبان زد خاص و عام ہو کر ضرب المثل بن جائے۔

'غزل اور عصرِ جدید' کتاب کا دوسرا مضمون ہے جو پہلی بار فروری ۱۹۴۲ء میں نگار میں شائع ہوا۔اپنے اس مضمون میں انہوں نے تحریر کیا کہ:

"تغزل فطرت انسانی کا تقاضا ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔غزل میں گل وبلبل اور بادہ وساغر کے طفیل ہی وہ رموز و کنایات ملتے ہیں جن کوٹی۔ایس ایلیٹ Objective Corelatives کہتا ہے۔غزل نے اردو شاعری میں وہ بلیغ رمزیت یعنی Symbolism اور آفاقی تمثیلیت یعنی Universal Allegorys پیدا کی ہے جس کی مثال کسی دوسری زبان کی شاعری مشکل سے ہی پیش کر سکتی ہے۔موجودہ غزل میں شعراء نے تصورات، محاکات، تاثرات اور اپنے تخیل کا دائرہ بہت محدود رکھا ہے۔جس سے ان کے اسالیب اور روایات میں تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے۔ان کی غزل موضوع اور مواد، سماجی شعور اور عام زندگی کے احساس سے خالی ہے اور موجودہ غزل میں وہ کس بل نہیں ہے جو متقدین کی غزل میں ملتا ہے۔"

ادب اور ترقی کتاب کا تیسرا مضمون ہے۔ مجنوں صاحب نے یہ مضمون سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں اردو کانفرنس کے اجلاس میں منعقدہ گورکھپور میں پڑھا تھا۔اس کے بعد یہ جریدہ 'تنویر' بمبئی میں شائع ہوا اور 'ادب و زندگی' میں بھی شامل ہے۔

اپنے اس مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ:

”حرکت اور تغیر ہی سب کچھ ہیں۔ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے جو بڑھتی رہتی ہے اور بہتر سے بہتر ہوتی رہتی ہے۔ ہم کو اس حقیقت کو نہ صرف محسوس اور تسلیم کر لینا چاہیے بلکہ اس سے خوش ہونا چاہیے اور نئے مستقبل کو لبیک کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ ماضی اور حال دونوں سے زیادہ خوبصورت اور شاندار ہوگا۔ اسی کا نام ہیگل اور مارکس نے جدلیات Dialectics رکھا ہے اور اسی کو برگساں نے تخلیقی ارتقا یعنی Creative Evolution کہا ہے۔ زندگی نہ صرف مائلِ ارتقا ہے بلکہ دورانِ ارتقا میں نت نئی صورتیں پیدا کرتی رہتی ہے۔

زندگی کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلتا رہتا ہے اور درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہتا ہے۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ ادب کو زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسی زندگی ہوگی ویسا ہی ادب ہوگا۔ اگر ادب کو ترقی کرنا ہے اور زندگی کی تعمیر و تکمیل میں نمایاں حصہ لینا ہے تو اس کو چاہیے کہ ماضی کا بار بار جائزہ لیتا رہے، حال میں مشغول رہے اور مستقبل کو پیشِ نظر رکھے۔

اردو ادب میں بھی ترقی کے کافی آثار ظاہر ہو چکے ہیں اور آئندہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ ہم کو صرف اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ زندگی کس سمت جا رہی ہے اور اس میں کون کون سے نئے اسباب و محرکات پیدا ہو رہے ہیں۔

اب تک ادب میں جس عنصر کی افراط رہی ہے وہ داخلی اور جمالیاتی تھا۔ اسی لیے ادب کے تفریحی رخ پر اب تک زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اب اس کے برعکس ادب میں خارجی عنصر کا غلبہ ہو رہا ہے اور اس کے عملی اور افادی رخ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن کامیاب ادب وہی ہے

جس میں یہ دونوں عناصر شیر و شکر ہو جائیں اور ایک مزاج ہو کر ظاہر ہوں۔"

'نیا ادب کیا ہے' کتاب میں شامل وہ مضمون ہے جو 'ادب اور زندگی' کی دوسری اشاعت میں شامل ہے۔ مجنوں صاحب اس مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"ادب صحیح معنوں میں ادب اسی وقت ہوگا جب کہ انسان کی زندگی کی تہذیب و ترقی میں مدد دے اور اس کو پہلے سے زیادہ پختہ اور پُر مغز بنائے۔ ادب ساکن و جامد تصورات کا اظہار نہیں ہے بلکہ دور بدور بدلتے ہوئے معاشرتی نظام کے ارتقائی سلسلے کا صرف ایک جزو ہے۔ ادب ہماری اس زندگی کی علامت ہے، جس کو سماجی زندگی کہتے ہیں۔

اب تک ہمارے ادب نے ہم کو بہت کچھ دیا یعنی جتنا کچھ کہ وہ دے سکتا تھا۔ اسلاف سے ہم کو جو ادبی ترکہ ملا ہے اس کی ہم قدر کرتے ہیں اور اس کو نئی ضرورتوں میں کام میں لانا اور اس کو نئی تہذیب اور نئے ادب کی ترکیب کا لازمی اور حقیقی جزو بنا لینا بھی ہمارے نصب العین کا ایک خاص حصہ ہے۔ اب ہم کو تفریحی ادب کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایسے ادب کی ضرورت ہے جس کی جڑیں جمہور کی واقعی زندگی میں دور تک چلی گئی ہوں اور جو ہماری فکر اور ہمارے عمل دونوں پر حاوی ہو۔

ہم کو یہ جدلیاتی نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر قوت اپنے اندر ہی اپنی ضد کا مادہ بھی رکھتی ہے، بغاوت کے جراثیم، روایت کے اندر ہی موجود ہوتے ہیں اور روایت کو نہایت صحت بخش بغاوت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ حالی نے یہ کہہ کر بڑی بصیرت کا ثبوت دیا ہے کہ ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، اس کو قدیم نمونوں سے استثنا حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر

ترقی پسند ادب یعنی نئے ادب نے ان اصول و نکات پر اپنی بنیاد رکھی تو وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔"

غزل سرا

۳۰۲ صفحات پر مشتمل مجنوں کی ایک اور تنقیدی کتاب 'غزل سرا' پہلی بار ۱۹۶۴ء میں مکتبہ جامعہ، نئی دہلی نے شائع کی جس میں تیرہ مضامین ہیں۔

پہلا مضمون 'میر اور ان کی شاعری' کے عنوان سے ہے جس پر 'نکات مجنوں' کے ذیل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

'میر اور ہم' دوسرا مضمون ہے جس پر بھی 'ادب اور زندگی کے تحت بات ہو چکی ہے۔ 'خواجہ میر درد' تیسرا مضمون ہے۔ چوتھا مضمون قائم چاندپوری کے بارے میں اور پانچواں 'کلام بیدار'، چھٹا 'مصحفی اور ان کی شاعری'، ساتواں 'غزلیات حالی'، آٹھواں 'حضرت آسی کا تغزل'، نواں 'ریاض کی شاعری'، دسواں 'حسرت کی غزل'، گیارھواں 'فانی بدایونی'، بارھواں 'یاس عظیم آبادی' اور تیرھواں مضمون 'اصغر گونڈوی' کے سلسلے میں تحریر کیا گیا ہے۔ مجنوں صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

> "اصغر اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور اس انجمن میں ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کی شاعری میں جوش وخروش اور رندی ہے۔ وہ دل میں جسم کی لمسی کیفیات کے قائل ہونے کے علاوہ روح کی لطافت کو جسم سے بھی بے نیاز رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نہ مجاز کی شاعری ہے اور نہ حقیقت کی۔ اصغر کی شاعری فکر اور اسلوب دونوں اعتبار سے لطیف اور متین ہے۔ باوجود اس کے کہ چمن میں شاید ہی کوئی کلی یا پھول ایسا ہو جس کو اس نے چھوا یا چھیڑا نہ ہو۔"

دوش و فردا

۳۰۳ صفحات پر مشتمل مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی کتاب 'دوش و فردا' میں مقدمہ اور دیباچہ 'مجھے نسبت کہاں سے ہے' کے علاوہ مندرجہ ذیل آٹھ مضامین شامل ہیں۔

'شعر و غزل' پہلا مضمون ہے جس کے بارے میں پچھلے صفحات میں تحریر کیا جاچکا ہے۔

'حسن و فنکاری' دوسرا مضمون ہے جس کے بارے میں مجنوں صاحب نے اپنے منفرد اور مخصوص لب ولہجہ میں بات کرتے ہوئے حسن اور فنکاری دونوں کی انسانی زندگی میں اہمیت بتائی ہے اور حسن کو جمالیات کے پس منظر میں اس کی بنیاد قرار دیا ہے۔

'غزل اور عصرِ جدید' تیسرا مضمون ہے جس پر مختصراً پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں غزل کو بھی انسانی زندگی اور سماج کی ترجمانی کرنی ہوگی۔

'مارس ماہترلنگ اور مریم مجدلانی' کتاب کا چوتھا مضمون ہے۔ جو بلجیئم کے نوبل انعام یافتہ ادیب مارس ماہترلنگ کے ڈرامے 'مریم مجدلانی' کے متعلق ہے۔ یہ کہانی بائبل سے ماخوذ ہے اور مذہبی روایت پر مشتمل ہے۔ کہانی کا اختتام اس کے ہیرو کی المناک موت پر ہوتا ہے۔

'ادب اور ترقی' کتاب کا پانچواں مضمون ہے، جس کے بارے میں پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ اب اچھا اور نیا ادب داخلی اور خارجی عناصر کو ساتھ لے کر چلے گا۔

'نظیر اکبرآبادی' کتاب کا چھٹا مضمون ہے جو اس سے پہلے بھی مجنوں صاحب کی ابتدائی تنقیدی کتاب 'ادب اور زندگی' میں شامل ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے متعلق مجنوں صاحب نے تحریر کیا کہ:

> ''نظیر وہ پہلے شاعر تھے جن کو میں نے زمین پر کھڑے ہوئے زمین کی چیزوں کے متعلق بات چیت کرتے ہوئے پایا اور پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ شاعری کا تعلق روئے زمین سے بھی ہے۔ یہ تو سب محسوس کر رہے تھے

کہ اردو شاعری میں نظیر ایک نئی قوت اور ایک نیا امکان ہے مگر کوئی اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نظیر نے اردو شاعری میں اس بغاوت اور انقلاب کی بنیاد ڈالی ہے جس سے ہمارے شاعر اور ادیب آج تک موانست اور مساوات نہیں پیدا کر سکے۔ نظیر کو اردو شاعری کی کوتاہیوں کا احساس اس وقت ہوا جبکہ ان کے آگے پیچھے کی دنیا میں کسی کو بھی اس کا احساس نہیں ہوسکتا تھا۔ نظیر کے کلام کے مطالعے سے پڑھنے والے پر جو مجموعی اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ شخص اردو شاعری میں واقعیت اور جمہوریت کی بنیاد ڈالنے کی پہلی کوشش کر رہا ہے۔ نظیر کو اردو کا پہلا نظم نگار بھی کہا جاسکتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی خیالات کے شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ واقعات کے شاعر ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی جمہوری زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اسالیب ولب ولہجہ کو عوام سے ہم سطح رکھا۔ ان کی عوامی نظم کا ایک بند دیکھیے:

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصان ہویگا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر، پانی پئے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سَودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

'نیا ادب کیا ہے' کتاب کا ساتواں مضمون ہے جس پر پہلے بھی تحریر کیا جاچکا ہے کہ نیا ادب سماجی زندگی کا صحیح ترجمان ہونا چاہیے۔

'نیرنگ عشق' کتاب کا آٹھواں اور آخری مضمون ہے جس میں مجنوں صاحب نے ملاغنیمت کی

مثنوی 'نیرنگ عشق' کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ ۱۹۳۱ء میں 'ایوان' گورکھپور میں قسط وار شائع ہوا ہے اور ایک اور تنقیدی کتاب 'دوش و فردا' میں بھی شامل ہے۔ یہ مضمون مکاتیب کی شکل میں ہے جو 'پریم نگر' سے مشتاق نے اپنے دوست پریم صاحب کو تحریر کیے ہیں۔ مثنوی فارسی زبان میں ہے اور اس میں ایک نوخیز لڑکے سے کیے گئے عشق کا تذکرہ ہے۔

'مجھے نسبت کہاں سے ہے' مجنوں صاحب کا وہ دیباچہ ہے جو ماہنامہ 'دائرے' کراچی میں بھی شائع ہو چکا ہے اور جس میں انہوں نے اپنے جائے پیدائش اور جائے تربیت کے متعلق تحریر کیا ہے۔ اس کا حوالہ پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔

غالب۔ شخص اور شاعر

اقبال کی طرح غالب پر بھی مجنوں صاحب کی کوئی بھرپور تحریر سامنے نہ آنے کی وجہ تو مجنوں صاحب نے اپنی ایک تحریر میں واضح کر دی ہے اور اس ادبی دہشت گردی کا ذکر بغیر نام لیے کر دیا ہے جس میں ۱۹۲۲ء میں عبدالرحمٰن بجنوری کے مضمون کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی قاموسی مضمون لکھ کر انہوں نے غالب کا حق ادا کیا تھا اور جو لاہور کے ایک ماہوار رسالہ کو بھیج دیا گیا تھا جو وعدوں کے باوجود وہاں شائع نہ ہوا اور پھر کچھ عرصے بعد مضمون کے مختلف حصے چند دوسرے ناموں سے شائع ہوتے رہے۔ مجنوں صاحب کی معصومیت کہ انہوں نے اس کی کاپی بھی نہیں رکھی تھی لہٰذا وہ کچھ نہ کر سکے۔ مگر اس واقعے نے انہیں بہت دل برداشتہ کر دیا اور وہ دوبارہ بہت عرصے تک غالب کی شخصیت اور فن کے متعلق قلم نہ اٹھا سکے۔ یہ تو شبنم رومانی سے ان کی محبت اور خود شبنم صاحب کی عقیدت اور مستقل مزاجی کہ انہوں نے بالآخر مجنوں صاحب کو غالب کی شخصیت اور فن پر ایک سلسلۂ تقاریر کے لیے راضی کر لیا۔ ان کی تقاریر ریکارڈ کی گئیں اور پھر انہیں ٹرانسکرپٹ کر کے مکتبۂ ارباب قلم، کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۷۴ء میں شائع کر دیا گیا۔ اس طرح

پاکستان میں یہ مجنوں گورکھپوری کی اولین تصنیف ہے۔ یہ کتاب فی البدیہہ تقریریں ہیں جن میں ان کے مطالعے کی وسعت کے ساتھ ہی قوت حافظہ بھی نمایاں ہے۔

غالب ادب کی ایک ایسی شخصیت ہے جس کی فارسی اور اردو تحریروں کو سمجھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے کیوں کہ غالب کو وہی قاری بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے جس کا کلاسیکی ادب کا اور خصوصاً فارسی کا مطالعہ وسیع ہو۔ غالب کا عہد اور غالب، غالب۔ فکر ونظر، غالب۔ انداز بیاں، غالب اور ہم پر گفتگو کر کے بھی مجنوں صاحب جیسے خزینۂ علم کا شکوہ یہی ہے کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس سے جہاں غالب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں مجنوں صاحب کی علمیت کی نشاندہی بھی ہوتی ہے:

بیانِ گفتۂ غالبؔ نوشتہ ام مجنوںؔ

''خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم''

پردیسی کے خطوط

(حصہ اوّل)

پردیسی کے خطوط (حصہ اوّل) زندگی اور ادب کے بعض اہم مسائل پر مجنوں صاحب کے خیالات کا اظہار ہے۔ یہ اظہار خطوط کی شکل میں ہے جن میں عورتوں اور مردوں کو فرضی ناموں سے مخاطب کیا گیا ہے۔ خطوط کے مندرجات میں چند ٹھوس ادبی مباحث کو رومانی یا افسانوی روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس انداز میں ان مضامین کو لکھنے کے بارے میں مجنوں صاحب کا کہنا تھا کہ:

> ''اگر سنجیدہ مباحث کے لیے مکالمہ موزوں ہوسکتا ہے تو مراسلہ میں کیا قباحت ہے۔ آخر بارکلے نے اپنے فلسفیانہ افکار اور آسکر وائلڈ نے اپنے تنقیدی خیالات کو تمثیلی مکالمات کی شکل کیوں دی؟ اور افلاطون کا تو سارا فلسفہ ہی مکالمات کی صورت میں ہے۔ ذہن میں خیالات کی ایک طوفانی شورش تھی۔ ایک طرف اندرونی تحریک کا تقاضا کہ کچھ لکھا جائے دوسری طرف نظم و ترتیب کے ساتھ مسئلہ پر کوئی باضابطہ مقالہ تحریر کرنے کی تاب نہ تھی۔ اس لیے میں نے مراسلاتی اسلوب اختیار کیا جس سے بیک وقت افسانوی ذوق اور تنقیدی میلان دونوں کی تسکین ہوتی ہے۔''

'پردیسی کے خطوط' سے بقول مجنوں صاحب ان کی رومانیت اور عقلیت دونوں آسودہ ہوئی

ہیں۔ ان خطوط میں سنجیدہ موضوعات پر افسانوی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان کے مطابق محبت ایک ہمہ گیر اخلاقی قوت ہے جسے سماجی، حالات کی ابتری ہی شکست سے دوچار کر سکتی ہے۔ ان کے مطابق:

''محبت یعنی دو دلوں کے ایک ہونے کے لیے فراغتیں چاہئیں جو اس وقت تک ہماری دنیا کو میسر نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہمارا موجودہ اقتصادی نظام اور اجتماعی دستور بالکل بدل نہ جائے۔''(١٦)

خطوط علمی و ادبی موضوعات پر تحریر کیے گئے ہیں۔ جن میں بہت سے اہم لوگوں کی شخصیت اور ان کے فن پر تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو بھی کی گئی ہے جسے رومانی تنقید کی جدت بھی کہا گیا ہے۔ ان خطوط میں انہوں نے اشتراکیت کی حمایت، اردو کی تہذیبی اہمیت اور اس کے مستقبل کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح یہ خطوط تنقید کو افسانے کی چاشنی اور رومانویت کے ساتھ بیان کرنے کا ایک منفرد انداز ہیں۔

پردیسی کے خطوط میں جن مسائل کو اٹھایا گیا ہے، وہ زندگی اور ادب کے مستقل عنوانات ہیں جن کی اہمیت ہر دور اور ہر زمانے میں باقی رہے گی۔ مثلاً ایک خط میں فرانس کے غیر فانی شاعر وکٹر ہیوگو کے بارے میں معلوماتی بحث ہے تو دوسرے میں غزل کے اہم شاعر حضرت جگر مراد آبادی کی ادبی حیثیت اور اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ کسی خط میں رومان و محبت کی قدر اور ضرورت پر بحث چھیڑی گئی ہے تو کسی میں حب وطن اور وطنیت پر۔ کوئی خط زبان و تمدن اور اردو کے ماضی، حال و مستقبل سے متعلق ہے تو کوئی غالب کی شاعرانہ عظمت سے اور جس موضوع کو اٹھایا گیا ہے اس کے ہر پہلو پر مختصر مگر تشفی بخش بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجنوں صاحب نے ان خطوط میں چند ایسے مباحث پر اپنا اظہار خیال کیا ہے جن پر وہ عمر بھر غور کرتے رہے ہیں مگر مقالہ نگاری کا وقت نہیں مل سکا۔ انہوں نے ان خطوط یا مضامین کو افسانوی

رنگ دے کر جہاں اپنی رومانیت اور عقلیت دونوں کو آسودہ کیا ہے وہیں تنقید کے روکھے مضامین میں جان ڈال دی ہے۔ کتاب میں شامل تمام خطوط اردو کے مختلف جرائد میں شائع ہو کر اپنے قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

کتابی صورت میں پردیسی کے خطوط (حصہ اول) کو ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ خطوط نما تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ۲۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں آٹھ خطوط ہیں اور جنہیں مجنوں گورکھپوری نے 'پردیسی' کے نام سے تحریر کیا ہے۔

پہلا خط ۱۰ ارجون ۱۹۴۹ء کو ناہید کے نام تحریر کیا گیا ہے، جس میں اولاً سفر کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اقبال کے اس شعر کا سہارا لیا گیا ہے:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اس کے بعد انیسویں صدی کی اہم شخصیت، 'مصیبت زدوں کی داستان' کے مصنف اور فرانس کے عظیم ادیب وکٹر ہیوگو کی سیرت اور زندگی کی داستان پیش کی گئی ہے۔ جس کی زندگی میں ایک بے نام ونشان لڑکی ژولیت اس کے جذبۂ پرستش کا مرکز بنی۔ اس کی محبت ہیوگو کے حق میں ایک پاک کرنے والی آگ ثابت ہوئی۔ جس نے اس کو اشتراکی اور جمہوری بنا دیا۔ اب اس نے بالاعلان یہ فیصلہ کر لیا کہ دنیا کی افتادہ اور پامال ہستیوں کی محبت کو اپنی باقی زندگی کا رہنما بنائے گا۔ اب اس کے اندر جتنی طاقت ہے وہ بہت کمزوروں کی حمایت میں صرف ہوگی۔ مجنوں صاحب تحریر کرتے ہیں کہ یہ کیسی مکمل، کیسی بھرپور، کیسی پُر اعتماد، کیسی آسودہ غرض کہ کیسی قابلِ رشک زندگی تھی۔

دوسرا خط بھی ناہید کے خط کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے۔ چونکہ ناہید نے اپنے خط میں جگر مرادآبادی کا ایک شعر لکھا ہے لہٰذا پردیسی کے خطوط کا یہ جواب بھی جگر کی غزلیہ شاعری کا تجزیہ

ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جگر کی شاعری میں جو نیا پن ہے اس کا تعلق دراصل انداز اور اسلوب سے زیادہ ہے۔ فکر واحساس سے کم ہے اور جدید اردو غزل میں یہی اسلوب جگر کا اضافہ ہے۔ اردو غزل میں ابھی تک انقلاب اور ترقی کے عناصر اس طرح داخل نہیں ہو سکے ہیں جس طرح نثر و نظم کی اور صنفوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہم اب تک شکست خوردگی اور پامالی کو اپنے لیے ایک لذت بنائے ہوئے ہیں۔

تیسرا خط بھی ناہید ہی کے نام ہے جس میں 'محبت' کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''محبت دراصل ایک ہمہ گیر خلا کا ئناتی قوت کا نام ہے۔ قرنہا قرن سے ہم نے زبردستی اس کو ایک مخصوص اور محدود ذاتی اور زوال پذیر تجربہ کے دائرے میں قید کر رکھا ہے۔ فرائڈ اور اس کے پیروکاروں نے دنیا کو بہت گمراہ کیا ہے اور محبت کو محض ایک جنسی جذبہ مان کر بڑا ظلم کیا ہے۔ محبت حقیقتاً ایک عالمگیر تخلیقی قوت ہے، یہ اس قوت کا بدلا ہوا عنوان ہے جس کو زندگی کی قوت کہتے ہیں جو بقول ارسطو تمام کائنات کی حرکت کی ذمہ دار ہے۔ اگر محبت صرف جنسی میلان کا نام ہوتا تو اس کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے جلیل ترین مذہبوں کی زبانیں ہچکچاتیں اور وہ یہ نہ کہتے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ ویسی ہی محبت کرو جیسی کہ تم اپنے ساتھ کرتے ہو۔ اہل تصوف نے بھی خدا کو سراسر محبت تصور کیا ہے۔ انسانی زندگی میں محبت نام ہے اجتماعی تعلقات کا اور جوں جوں اجتماعی نظام بدلتا جائے گا، محبت کا تصور کچھ سے کچھ ہوتا جائے گا۔ ذات کی محبت سے بال بچوں کی محبت، بال بچوں کی محبت سے قبیلہ کی محبت، قبیلہ کی محبت سے نسل کی محبت، نسل کی محبت سے ملک کی محبت، ملک کی محبت سے قوم کی محبت اور اب قوم کی محبت سے بنی نوع انسان کی محبت جس کو آفاقیت کہتے ہیں۔ یہ ہے محبت کی ارتقائی رفتار۔ محبت یعنی دو دلوں کے ایک ہونے کے لیے کچھ آزادیاں، کچھ فراغتیں چاہئیں جو اس وقت ہماری دنیا کو میسر نہیں اور جو اس وقت تک میسر نہیں ہو سکتیں جب تک ہمارا موجودہ اقتصادی نظام اور اجتماعی دستور بالکل بدل نہ جائے۔ میر نے کہا تھا:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یہ ہے محبت اور یہ ہے موت اور یہ ہے دونوں کے درمیان باہمی نسبت۔"

چوتھا خط بھی ناہید کے نام ہے جس میں وطن کے ساتھ محبت اور وطنیت یا وطن پرستی کے فرق پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے اور وطنیت کو سب سے زیادہ مہلک میلان قرار دیا گیا ہے جس میں آدمی جامۂ بشریت سے عاری ہوسکتا ہے اور نامعقول سے نامعقول خیال اس پر غلبہ پاسکتا ہے۔ وہ بے انتہا ہٹ دھرم ہوسکتا ہے۔ لہٰذا وطنیت کا اندھا جذبہ ہمارے لیے ایک لعنت ہے۔

"خدا نے کرے کہ شخصی یگانگت کا احساس کسی شعور پر اس طرح غالب آئے کہ وہ اس کو اجتماعی احساس سمجھنے لگے یا اپنی غرض کی تکمیل کے لیے جان بوجھ کر زبردستی اس سے اجتماعی شعور کو متاثر اور مغلوب کرنے کی غلیظ کوشش کرے۔"

پانچواں خط منوہر کے نام ہے جس میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ زندگی کے نئے نظام کی غایت کیا ہے؟ اور اس میں افراد کا مقدر کیا ہوگا؟

اسی سلسلے میں یہ کہا گیا کہ افراد کے بگڑے ہوئے مقدر اور ان کی موجودہ ابتر زندگی کو سنوارنا اور اس کو ایک اطمینان بخش معیار تک لے آنا ہی ہیئت اجتماعی کا اصلی اور آخری فرض ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے پہلا سوال شخصی اور ذاتی سرمایہ کے ادارے کو مٹانا ہے۔ شخصی جائیداد یا سرمایہ اور نجی منفعت و مفاد کا نظام ایک ایسی بنیادی خرابی ہے جو بے شمار اخلاقی اور تمدنی خرابیوں کی جڑ ہے۔ ان خرابیوں کا سلسلہ قیامت تک چلا جائے گا اگر جاگیرداری اور سرمایہ داری کے دستور کو اب جلد سے جلد ختم نہ کر دیا گیا۔ دولت اور ملکیت کو چند غاصبوں سے چھین کر اس کو عوام الناس کا حق بنانا ہے۔ اب ہم کو قصداً اور اہتمام کے ساتھ عوام کے دل و دماغ میں انقلابی شعور

بیدار کر کے دنیا کے نظام کو جلد سے جلد بدلنا ہے۔ یہ سارا کام اجتماعی طور پر پوری انسانیت کے لیے کرنا ہے جیسا کہ علامہ اقبالؔ نے بھی کہا ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تمام تر غور و فکر کے بعد نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اشتراکیت کی انتہائی غایت افراد کی فلاح و ترقی ہے اور صحیح و صالح انفرادیت ہم اشتراکیت کے ذریعے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ جبکہ اشتراکیت کا نصب العین اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہر فرد اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے بہترین مواقع اور ذرائع حاصل کرے، جو سماج کے لیے مفید اور مبارک ثابت ہو سکتی ہیں۔

شعور وہ، جو ترقی پسندی دیتی ہے

اسی شعور کو اب آزمانا چاہیے ہے

چھٹا خط بھی منوہر کے نام ہے، جس میں سوال اٹھایا گیا ہے کہ اردو زبان کی موجودہ صورت حال میں اس کے چاہنے والوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے کہ اردو ایک جمہوری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی۔ وہ شہر کے بازاروں میں پیدا ہوئی، درویشوں اور صوفیوں کی صحبت میں اس کی تر بت ہوئی اور پھر وہ بادشاہوں اور نوابوں کی منظور نظر بنی۔ جو معاشرت اور جو زبان فراخ حوصلگی، وسعتِ نظر اور آزادیٔ خیال سے کام نہیں لیتی اور اپنے کو تمام باہری عناصر سے پاک رکھتی ہے اور اس پر ناز کرتی ہے، اس کی عملداری محدود اور اس کی عمر کم ہوتی ہے۔

اردو حروف تہجی ایک اور لحاظ سے بھی قابلِ ترجیح ہیں۔ ان میں آریائی، سامی اور دوسری نسلوں کی تمام زبانوں کے جملہ اصوات کو ادا کرنے کی سکت ہے۔ جس طرح اردو لغات اور محاورات میں ہمہ گیری ہے اسی طرح اصوات میں بھی ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کی زبان کے تمام حروف کی

آوازوں کو اس نے اپنا لیا ہے۔

تہذیب اور زبان لازم و ملزوم ہیں اور تہذیب و زبان دونوں کے معاملے میں ہمارے ملک نے بڑا خطرناک اور مہلک راستہ اختیار کیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال نے اپنی مجذوبانہ مشرق پرستی کی دھن میں مغربی تہذیب کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ کہیں ہماری اپنی تہذیب پر نہ صادق آئے اور کسی کونے سے کوئی حق پرست کہیں پکار نہ اٹھے:

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ساتواں خط گلنار کے نام ہے جس میں مجنوں صاحب نے غالب کی شخصیت اور فن پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''نئے دور کی کئی وسعتوں سے الجھی ہوئی نفسیات اور زندگی کی پُر پیچ کشمکش کا شعور جس عارفانہ انداز میں غالب ہمارے اندر پیدا کرتا ہے اس کی دوسری مثال اردو شاعری کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج نصف صدی سے زائد گزر جانے کے بعد بھی نوجوان ذہن اپنی تمام جدت طرازیوں کے باوجود غالب کو اپنا نمائندہ پاتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غالب زندگی کی جدلیاتی یعنی پُر تضاد اور نامیاتی یعنی ترقی پذیر ماہیت کا فطری شعور رکھتا تھا، اور دوسروں کے اندر یہ شعور پیدا کرنے کا سلیقہ اس کو معلوم تھا۔ اس لحاظ سے نہ صرف اردو کا بہت بڑا شاعر ہے بلکہ دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہے۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

غالب واقعی اردو شاعری کا ایک نبی یا اُوتار ہے، اس نے اردو شاعری کو وہ کچھ دیا جو اس سے پہلے کوئی شاعر نہیں دے سکا تھا۔ ذرا سوچو کہ اردو شاعری غالب سے پہلے اور خود اس کے زمانہ میں کیا تھی اور اس کے بغیر کیا رہ جاتی۔ غالب نے اردو شاعری کو نہ صرف غلط اور غیر فطری میلانات کے خطروں سے بچالیا بلکہ اس فکر و تامل اور استفسار و تفحص کے رجحانات پیدا کر کے اس کو بھر پور اور ساری زندگی کا ہم وزن بنایا۔ غالب کو اردو کا پہلا مفکر شاعر کہنا غلط نہ ہوگا۔ اردو زبان میں غالب کی آواز پہلی آواز ہے جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے۔

اگر شاعری کی یہ تعریف صحیح ہے کہ وسیع سے وسیع خیالات کو کم سے کم الفاظ میں ادا کر دیا جائے اور معنی میں اختصار کی وجہ سے کوئی خلل نہ پیدا ہو تو غالب دنیا کا بہت بڑا شاعر ہے۔ خود غالب کو اس کا احساس ہے۔ وہ کہتا ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھنا
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے''

آٹھواں خط بھی گلنار کے نام ہے اور ۱۵ ر مئی ۱۹۵۶ء کو تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں جدید روس کے ایک شاعر یسینین (Essenin) کا تذکرہ ہے جو پشکن کے بعد اپنے ملک کا سب سے بڑا شاعر تھا، کیوں کہ جدید روس کے کسی دوسرے فنکار میں ایسی معصوم جمالیاتی بصیرت اور شعر و سرود کی ایسی بے ساختہ صلاحیت نظر نہیں آتی۔

قدرت نے یسینین کو شاعر اور رامش گر پیدا کیا تھا۔ اس کا فن سعی و اکتساب کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اصلی معنوں میں قدرت کا عطیہ تھا۔ اس کی بہترین نظموں کی ممتاز خصوصیت اس کے غنائی اسلوب

کی وہ سادگی اور سچائی ہے جو اس کے سواروس کے کسی دوسرے نوجوان شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

اس نے انقلاب سے اپنے دلی لگاؤ کے بارے میں کہا:

"میں سب کچھ قبول کرتا ہوں

جو صورت حال ہے اس کو جوں کا توں تسلیم کرتا ہوں

میں اس شاہراہ پر چلنے کے لیے تیار ہوں جو ابھی کاٹ کر بنائی گئی ہے۔

میں اپنی ساری روح اکتوبر اور مئی کی نذر کرتا ہوں"

مگر انقلاب کے عملی روپ نے اس کے تخیل کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ اس احساس نے اس کی ساری زندگی کو جہنم بنا دیا تھا جس کی آنچ وہ برداشت نہ کر سکا اور عمر عزیز کے مشکل سے تیس سال پورے ہو رہے تھے کہ اس نے فرار اور پناہ کا سب سے آسان طریقہ اختیار کر لیا یعنی خودکشی کر لی۔ اس نے اپنے خون سے جو آخری نظم لکھی تھی، وہ یہ تھی:

"میرے دوست الوداع

بغیر مصافحے اور رخصتی الفاظ کے الوداع

غم نہ کرنا

اپنی پیشانی پہ شکن نہ آنے دینا[88]

مرنا کوئی نئی بات نہیں ہے

اور نہ زندہ رہنا ہی کوئی نئی بات ہے"

پردیسی کے خطوط

(حصہ دوم)

خطوط کے پیرائے میں مجنوں گورکھپوری کے یہ رومانی وافسانوی تنقیدی مضامین آٹھ خطوط پر مشتمل ہیں۔ یہ خطوط مہربان، یاسمین اور گلنار کے فرضی ناموں سے تحریر کیے گئے ہیں۔

پہلا خط کسی مہربان خاتون کے نام ۱۰ر فروری ۱۹۵۸ء کو تحریر کیا گیا ہے جبکہ مخاطب شخصیت کو لفظ مہربان پر اعتراض ہے اس لیے مجنوں صاحب لفظ مہربان کے متعلق اپنی تحقیق پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ جس سے ان کی فکر کی وسعت اور گہرائی وگیرائی کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرا خط یاسمین کے نام ۲۵؍مارچ ۱۹۵۸ء کو تحریر کیا گیا ہے جس میں اکبرالہ آبادی کے فن پر انہوں نے بہت اختصار سے گفتگو کرتے ہوئے ان کی مزاحیہ شاعری کو مقصدی قرار دیا اور اکبر کو معاشرتی مصلح قرار دیا۔

تیسرا اور چوتھا خط بھی یاسمین کے نام ہے جس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیبؑ کے واقعات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے اور ان روایتوں میں قرآن کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ اس طرح ان تحریروں کو تاریخی واساطیری روایات پر مبنی رومانوی تحریروں کا نام دیا جاسکتا ہے۔

پانچواں خط بھی یاسمین ہی کے نام ہے جس میں اردو ادب کے ایک اہم شاعر اور ممتاز غزل گو حضرت شاد عظیم آبادی کی شاعرانہ شخصیت کو موضوع تحریر بنایا گیا ہے۔ ان کی بامعنی اور غور وفکر سے لبریز شاعری قاری کو دعوت فکر دیتی ہے:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

چھٹا خط روسی ناول نگار بورس پاسترناک کے ناول ڈاکٹر ژیواگو کے بارے میں ہے۔ جس میں پاسترناک کے اشتراکی نظریات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ دورانِ گفتگو انہوں نے اشتراکیت کی خامیوں پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔ جس کے سبب وہ ادبی دنیا میں ایک سچے نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

ساتویں خط میں مجنوں صاحب نے بیدل کے حالات زندگی، شعری ونثری تخلیقات اوران کے فکروفن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اس نے زندگی کے اندرونی تضادات اور تناقص بالذات اصلیت کا ادراک عطا کیا ہے۔ بیدل پر مجنوں صاحب کا یہ خط نما مضمون ان کی تنقید کا اچھا نمونہ ہے جس میں انہوں نے بیدل کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے علاوہ حکمت وفلسفہ، اخلاق ومعاشرت، مذہب ومعرفت پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔

آٹھویں خط میں مجنوں صاحب نے یاسمین کی خواہش پر شیلے کی نظم السٹور (Alastor) پر تبصرہ کرتے ہوئے رومانیت پر اہم گفتگو کی ہے۔ رومانیت کی تاریخ سقراط سے شروع ہوکر شیلے تک پہنچتی ہے جو رومانوی شاعر ہونے کی وجہ سے اپنے آئیڈیل پر کسی قسم کے Compromise کے لیے راضی نہیں تھا۔

مجنوں گورکھپوری کا کہنا تھا کہ شیلے نے انسانی زندگی سے دکھ، محتاجی اور خباثتیں دور کرنا اپنا نصب العین بنالیا تھا، اور وہ بنی نوع انسان کی زندگی میں آزادی، فراغت، جسمانی اور روحانی آسودگی دیکھنا چاہتا تھا۔

مجنوں صاحب کی یہ تخلیقات جن کو انہوں نے خطوط کے انداز میں پیش کیا ہے ان کی رومانی تنقید کا بہترین نمونہ ہیں۔

تالیفات (ترتیب و تدوین)

مجنوں صاحب نے شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید و تحقیق کے علاوہ ادبی جواہر پاروں کی تدوین و ترتیب کا کام بھی بہت حسن وخوبی سے انجام دیا ہے۔

مثنوی زہرِ عشق

ان کی ترتیب و تدوین کا پہلا نمونہ ۱۹۳۰ء میں ایوانِ اشاعت، گورکھپور سے ۱۶۴ صفحات پر مبنی مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' کی اشاعت ہے جس میں ۱۴۱ صفحات پر مبنی ان کا ایک طویل مضمون 'مرزا شوق اور مثنوی زہرِ عشق' پیش لفظ کے طور پر شامل ہے۔ جب کہ نیاز فتح پوری کا مضمون 'اردو کا ایک بدنام شاعر' اور احسن لکھنوی کا مضمون 'مثنوی زہرِ عشق کیونکر وجود میں آئی بھی شامل اشاعت ہیں۔

زہر عشق کی ساری کہانی ماہ جبیں کے گرد گھومتی ہے جو اس مثنوی کی ہیروئین ہے۔ مجنوں صاحب نے ماہ جبیں کو لیوٹالسٹائے کی اینا کرینینا اور 'شاہنامہ' کی منیزہ سے تشبیہ دی ہے۔ مگر اس میں شرم وحیا کا ایک اضافی عنصر ہے جو مشرق کی پہچان ہے۔ اسے پندار عشق کا احساس ہے۔ وہ مر کر بھی رسوا نہیں ہونا چاہتی:

میرے مرنے کی جب خبر پانا
یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا

ذکر سن کر مرا نہ رو دینا

میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

مجنوں گورکھپوری نے تحریر کیا ہے کہ نواب مرزا شوق کی 'زہر عشق' کا اردو ادب میں وہی مقام ہے جو جرمن ادب میں فلسفی اور افسانہ نگار گوئٹے کی 'آلام ورتھر' (Sorrows of Werther) کو حاصل ہے۔

مجنوں صاحب کی یہ خوبصورت تدوین خوبصورتی کے لحاظ سے ان کی بہترین تالیف ہے اور وہ اسکے اولین تعارف کنندگان میں سرِ فہرست ہیں۔

مثنوی حسن فطرت

۱۹۳۱ء میں مجنوں صاحب نے ایک اور اہم تدوینی کام کیا، یعنی منشی عبرت پرشاد کی مثنوی 'حسن فطرت' کی ترتیبِ نو۔ یہ مثنوی ان کے گہرے دوست فراق گورکھپوری کے تعاون سے شائع ہوئی۔ مجنوں صاحب نے بھی تحریر کیا کہ یہ مثنوی فراق کے مذاقِ شعری کا نتیجہ ہے کہ ان کے والد کا کلام اتنے عرصے تک محفوظ رہ گیا۔ ورنہ اب تک کئی من مٹی کے نیچے دب کر مٹی میں مل گیا ہوتا۔ اس لیے کہ گھر میں کوئی دوسرا ایسا نہ تھا جو اس کی قدر کرتا اور اس کو زمانے کی دستبرد سے بچاتا۔ مجنوں صاحب نے حسن فطرت کو ۵x۴ کی چھوٹی تقطیع پر شائع کیا تھا اور یہ ۸۰ صفحات پر مشتمل تھی۔

مختصراً مثنوی کی کہانی اس طرح ہے کہ جسم کی ملکہ روح کا بیٹا دل سیر کرتے ہوئے نیرنگ شاہ کی بیٹی حسن کے باغ میں پہنچ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حسن کا مشیر تغافل دل کو قید کر لیتا ہے۔ ملکہ پریشان ہو کر اپنے مشیر عقل کو اس کی تلاش میں بھیج دیتی ہے۔ عقل اسے ڈھونڈتے ہوئے نیرنگ شاہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ یہیں مثنوی اپنی تشنگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ مثنوی

بھی دیگر دوسری مثنویوں کی طرح حسن و عشق، ہجر و فراق اور جادوئی کرشموں سے مزیّن ہے۔
عبرت نے دل کی موت سے چار اشعار قبل خاتمہ کا عنوان دے کر مثنوی کو اچانک ختم کر دیا ہے:

اخیر حکم سنانے کو بھی اجل آئی
سزائے موت دل نامراد نے پائی
یہ حال دیکھ کے وہ بحرِ غم میں ڈوب گیا
اور اس کے ساتھ ہی عبرت کا بھی پتہ نہ چلا

نیستاں

مجنوں گورکھپوری کی تیسری تدوینی کاوش 'نیستاں' ہے۔ یہ ۱۵ر فروری ۱۹۳۷ء کو میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج گورکھپور میں منعقد ہونے والے مشاعرے کی روداد ہے۔ جس میں جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی اور دوسرے اہم شعراء کے علاوہ طلباء نے بھی شرکت کی۔ مشاعرے میں ایک جدت یہ بھی تھی کہ اس میں طرحی نظمیں پڑھی گئی تھیں۔

تدوین میں کئی چیزیں کھٹکتی ہیں۔ جیسے شعراء کے تعارف کا فقدان اور ترتیب میں تقدیم وتاخیر کا خیال نہ رکھنا۔ بہرحال اس سے مجنوں صاحب کی تالیفات میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کی ایک نئی جہت کا پتہ چلتا ہے۔

دیباچے، پیش لفظ اور تبصرے

تبصرے کو مختصر تاثراتی تنقید بھی کہا جاسکتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے تحقیق وتنقید کے علاوہ مختلف کتابوں پر تبصرہ نگاری بھی کی ہے اور دیباچے بھی تحریر کیے ہیں۔ علی سردار جعفری کا شعری مجموعہ ''پرواز'' مجنوں صاحب کے دیباچے سے مزین ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مجنوں صاحب نے تحریر کیا:

> ''جن جوانوں، ادیبوں اور صناعوں نے حیات انسانی کی تاریخی رفتار کا مطالعہ کیا ہے ان میں علی سردار جعفری ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی جدلیات کو سمجھا ہے۔ علی سردار جعفری کی نظموں کا تعلق زیادہ تر ایسے موضوعات اور مسائل سے ہے جن کو وقت کا راگ کہنا چاہیے۔''

خورشید الاسلام کے مجموعۂ کلام ''رگ جاں'' کا دیباچہ تحریر کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے ان کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری میں جذباتی شدت، توازن ور سنجیدگی کو محسوس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> ''خورشید الاسلام کی شاعری اس لیے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ وہ قدامت پرستی کے دشمن ہوتے ہوئے بھی اپنی ثقافتی میراث کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔''

وحید اختر کے شعری مجموعے 'پتھروں کا مغنی' کے متعلق فلیپ پر تحریر کردہ مجنوں صاحب کا تبصرہ

مختصر ہونے کے باوجود اپنی ادبی اور تنقیدی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس فلیپ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''وحید اختر کی غزلیں بھی اس طرح دل ودماغ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں جس طرح ان کی نظمیں۔ ان کی ہر غزل نئے ذہن کی نمائندگی کرتی ہے۔''

اقبال شوقی کی رباعیات کے مجموعے 'آئینۂ اعتبار' کے دیباچے میں مجنوں صاحب نے ان کے کلام کے ساتھ ہی ان کی شخصیت کو سراہا ہے۔ جس کو اپنے قیام کراچی کے دوران انہوں نے دریافت کیا اور ان کی رباعیات کے تخلیقی ہنر کو پہلی یا دوسری ملاقات ہی میں ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کی رباعیات کے بارے میں مجنوں صاحب کی تنقیدی رائے یہ ہے کہ:

ان کی تخلیق کردہ رباعیات رباعی کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ان کی رباعیوں میں وہ جامعیت ہوتی ہے جس کو اس فن کا طبعی تقاضا بتایا گیا ہے۔''

نعیم جمالی کے شعری مجموعے 'جنبشِ لب' پر تحریر کردہ مجنوں گورکھپوری کا تبصرہ اس بات کا غماز ہے کہ نعیم جمالی کے کلام میں جان ہے اور وہ سخت سے سخت نقاد کو بھی اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''نعیم کے اشعار میں روایت کے زندہ عناصر اور ذہنِ جدید کے میلانات کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی ہر غزل کے کچھ اشعار قاری کو تھم کر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔''

'مجاز۔ سوانح وشخصیت' محمد حسین دیپک کا ایم اے کا مقالہ ہے۔ جس کا دیباچہ تحریر کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے ان کی محنت وکاوش اور ذوق وانہماک کی تعریف کرتے ہوئے تحریر کیا کہ:

''مجاز پر جتنا تنقیدی کام اب تک شائع ہوا ہے، محمد حسین دیپک نے اُس

سب کا عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کر کے اپنے مقالہ کا مواد جمع کیا ہے۔
مقالہ کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اختصار کے باوجود مجاز کی زندگی،
ان کی شخصیت اور ان کی شاعری کے تمام اہم عناصر کی خصوصیات سامنے
آ گئی ہیں اور کوئی رخ ایسا نہیں ہے جو نظروں سے پوشیدہ رہ گیا ہو۔''

'نوائے بے نوا' مسرت علی صدیقی کا مجموعۂ کلام ہے۔ جس کا فلیپ تحریر کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری پاکستان میں ان سے اپنی قربت، محبت اور ان کی عقیدت کا اظہار چند الفاظ میں یوں کرتے ہیں کہ:

''ان کے مختصر کلام کا حجم اس بات کی علامت ہے کہ وہ کبھی بغیر شدت تاثر
کے کوئی بات نوک زباں یا نوک قلم تک نہیں لاتے۔ یہ بے تکلفی اور بے
ریائی ان کے کلام کی تاثیر کو ہمیشہ قائم رکھے گی اور دل و دماغ کو ہمیشہ
متاثر کرتی رہے گی۔''

مبارک منگیری معروف شاعر ہیں جن کے مجموعۂ کلام 'صحرا سے گلستاں تک' پر کیا گیا مجنوں گورکھپوری کا تبصرہ ان کی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اپنے اس تبصرے میں انہوں نے تحریر کیا کہ:

''وہ لکھتے جائیں گے اور پڑھنے والے جب پڑھیں گے تو ان کو ارباب قلم
ہی میں جگہ دیتے ہوئے پڑھیں گے، اور پڑھتے ہوئے جگہ دیں گے۔ وہ
صحیح معنوں میں وطنیت اور آزادی کے شاعر ہیں۔''

مجنوں گورکھپوری نے اپنے وطن یعنی گورکھپور ہی کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر ثنا گورکھپوری کے مجموعۂ کلام 'دھند میں آفتاب' پر تبصرہ کرتے ہوئے عروض وفن کی طرف ان کی بے احتیاطیوں کی طرف انہیں متوجہ کیا ہے اور انہیں چند ماہرانہ اور بزرگانہ مشورے بھی دیے ہیں کہ:

''وہ آزاد نظم نہ کہیں۔ اس کے بجائے اگر وہ ہندی کی کلاسیکی نظم ونثر پر اردو میں کچھ سنجیدہ کام کرڈالیں تو یہ بھی ان کا بڑا اور اہم کام ہوگا۔''

'مکالمات' تنقید پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی ایک اہم کتاب ہے۔ مجنوں صاحب کا تبصرہ اس کے فلیپ پر شائع ہوا ہے۔ جس میں مختصراً انہوں نے یوں تحریر کیا ہے کہ:

''محمد علی صدیقی اپنے اس مجموعے کے ایک ایک صفحے پر اپنی سچی اور بے ریا طبیعت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ مجھے ان کی کتاب کی ہر سطر میں لکھنے والے کا کردار اجاگر ہوتا ہوا محسوس ہوا ہے۔ وہ ادب کی مشرقی اور مغربی روایات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔''

مجنوں گورکھپوری نے اپنے ایک معاصر اور ترقی پسند ادب کے ایک اوّلین معمار ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت سوانح حیات 'گردِ راہ' پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ جو کتاب کے فلیپ پر شائع ہوا ہے۔ اپنے اس تبصرے میں مجنوں گورکھپوری نے تحریر کیا ہے کہ:

''برصغیر کی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کے دور یعنی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے میں بڑے بڑے مدبر و مفکر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں میں ایک اہم نام اختر حسین رائے پوری کا بھی ہے۔ جن کے عہد آفریں مضمون 'ادب اور زندگی' کو ترقی پسند تحریک کا سنگِ بنیاد مانا جاتا ہے۔ وہ راہی بھی رہے ہیں اور راہبر بھی۔ ان کی یہ کتاب ادب و تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے سنجیدہ حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔''

'داغ داغ اجالا' ساحل قزلباش کا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۰ء میں کراچی سے شائع ہوا ہے۔ ان کے اس مجموعے پر مجنوں صاحب کا تبصرہ ساحل قزلباش سے ان کے تعلقات کی بنیاد پر تحریر کیا گیا ہے۔ مجنوں صاحب نے اپنے اس تبصرے میں ساحل قزلباش سے اپنے دیرینہ مراسم کے

پس منظر میں یوں تحریر کیا کہ:

''ایک شخص اور شاعر کی حیثیت سے ساحل قزلباش کو میں گیارہ سال سے جانتا ہوں اور دونوں حیثیتوں سے میں نے ان کو کھرا اور نڈر مگر مہذب اور شائستہ پایا ہے۔ انہوں نے زندگی کے سارے آداب برتتے ہوئے اپنی یہ وضع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دی۔ نظم ہو یا غزل ان کے ہر مصرعے پر ان کے اپنے مزاج کی مُہر ہوتی ہے۔''

نازش حیدری کے شعری مجموعے 'صدیوں کا سفر' پر مجنوں گورکھپوری کی مختصر تحریر ان کے روایتی تبصرے کی ایک اور مثال ہے جس میں یوں لکھتے ہیں کہ:

'' یہ شاعری نہیں زندگی ہے اور اس زندگی کو سمجھنے کے لیے بھی ایک شعور درکار ہے۔ واہ واہ کردینا دوسری چیز ہے۔ مگر ایسے تجزیوں تک پہنچنے کے لیے شعور کی حاجت ہے۔ جس کا شعور تیز ہے وہی زندگی کو سمجھ سکتا ہے۔ نازش حیدری اسی شعور زندہ کے مالک ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کے شعور کو بھی جگا دیتے ہیں۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی کے 'مقدمہ کلام آتش' پر مجنوں گورکھپوری کا تبصرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی اس تحریر کو انہوں نے 'آتش کا نیا مطالعہ' کے عنوان سے ماہنامہ 'ساقی' کراچی میں جولائی ۱۹۶۲ء میں شائع کروایا۔ اپنی اس تجزیاتی تحریر میں وہ کہتے ہیں کہ:

''اعظمی نے آتش کی شخصیت اور ان کے شاعرانہ مزاج کا اصلی راز پالیا ہے اور اس کو بڑے احسن اسلوب کے ساتھ سمجھایا ہے۔ انہوں نے جو اشعار منتخب کیے ہیں، وہ گویا کلام آتش کا نچوڑ ہیں۔ ان کا انداز بیان بڑا متوازن اور سلجھا ہوا ہے۔ اگر ان کو کسی کی رائے سے اختلاف ہے تو اس میں کوئی

شدّت نہیں اور نہ ہی اپنی رائے پیش کرتے ہوئے ان کو غلو کے ساتھ کوئی
اصرار ہے۔ یہ انداز بیان تنقید کے لیے نہایت ضروری ہے۔''

ناقدین کی آراء

علامہ نیاز فتح پوری

مجنوں صرف افسانہ نگر نہیں بلکہ وہ نہایت بلند فلسفیانہ ذوق بھی رکھتے ہیں اور یہ دونوں باتیں ان میں اس قدر حسن کے ساتھ ملی ہوئی ہیں کہ شوپنہار کی طرح ہم ان کے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان دنوں میں کون سا عنصر ان میں غالب پایا جاتا ہے۔ اس لیے شوپنہار کے فلسفے کو اردو میں مُنتقل کرنے کے لیے مجنوں سے زیادہ اہل کوئی دوسرا شخص ہو نہیں سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ فلسفے کے خشک مباحث پر انھوں نے کس قدر شگفتگی و ادبیت سے گفتگو کی ہے۔

فراق گورکھپوری

ہماری باہمی ہم آہنگی اور قربت اس وجہ سے تھی کہ مجنوںؔ کی شخصیت میں غالب عنصر حساس عقلیت کا تھا اور میرے اندر غالب عنصر ذہن کی روحانیت اور وہ وجدانیت تھی جو بعد کو میری شاعری میں نمایاں ہوئی۔ میں ان کی جچی تلی باتوں پر فریفتہ تھا اور وہ میری باتوں کی اشاریت اور رمزیت کے شیدائی تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے سیکھتے تھے۔

کئی لحاظ سے میں مجنوںؔ کو اپنے آپ سے ایک بہتر انسان سمجھتا ہوں۔ وہ غلط باتوں پر جھلاّ ہٹ کی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن غالب کی طرح یا میری طرح غیر مہذب الفاظ میں انہوں نے کبھی اظہار عتاب نہیں کیا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائپوری

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو عمرِ طبعی پر پہنچ کر وثوق سے کہہ سکیں کہ 'کار کردم'۔ اگر مجنوں صاحب یہ دعویٰ کریں تو حق بجانب ہے۔

پچاس سال کی طویل مدت تک درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے وسیلے سے ادب آموزی کرنا بذات خود ایک کارنامہ ہے، کارنامہ ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ یوں جدید اردو ادب کی رہنمائی میں جن نقادوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں مجنوں صاحب کی حیثیت بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔

سجاد ظہیر

گورکھپور میں ہماری انجمن کی کوئی شاخ نہیں تھی لیکن مجنوں کی ذات ہی ایک انجمن تھی۔ میں برسوں پہلے ان سے تھوڑی دیر کے لیے لکھنو میں علیم کے گھر پر ملا تھا۔ اس کے بعد ان سے ملنے کا بہت اشتیاق رہ لیکن کبھی موقع نہ ملا۔ تاہم مجنوں کے مضامین اور دوسری نگارشات کے ذریعے اور پھر کئی مشترکہ دوستوں (فراق وعلیم) کے وسیلے سے میں ان سے کافی واقف تھا۔ وہ ہماری زبان کے صاحبِ طرز ادیبوں، نکتہ رس اور فہیم نقادوں اور علم دوست شخصیتوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے اس کے آغاز سے ان کا الحاق میرے نزدیک کافی اہم بات تھی۔

علی سردار جعفری

تحریک کے ابتدائی زمانے میں مجنوں گورکھپوری نے اپنے تنقیدی مضامین سے تحریک کے اغراض ومقاصد کے پھیلانے میں بڑا کام کیا اور نئے اصول تنقید بنانے میں بڑی مدد کی۔ انھوں

نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ادب زندگی کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور نقاد بھی اور زندگی کے ساتھ سائے کی طرح وابستہ ہے۔ اس لیے زندگی کی تبدیلی کے ساتھ ادب بھی بدلتا ہے۔ ان کے مخاطب زیادہ تر قدامت پرست عناصر تھے جنھیں انھوں نے سماج کے 'بڑے بوڑھوں' کے نام سے یاد کیا ہے۔ مجنوں نے اپنے اسی مقالے میں اس مقصد کی بھی تشریح کر دی ہے جس کی تکمیل کا حق مانگا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے ترقی پسند ادب کے اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ ادب کو پرکھنے کے لیے ایک نئی کسوٹی بنانے میں بھی مدد دی۔

سید سبط حسن

مجنوں صاحب ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں سے ہیں، بلکہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے آغاز سے پہلے بھی وہ زندگی اور ادب کی ترقی پسند اقدار ہی کی ترجمانی کرتے تھے۔

مجنوں صاحب کے بعض ہمسفروں اور ہمصغیروں نے پٹڑی بدل لی ہے یا تھک ہار کر بیٹھ رہے ہیں، مگر یہ پیر جواں فکر آج بھی اپنے قلم کی پاک دامنی کا پرچم لہرا رہا ہے۔ وہ قلم جس نے ہماری کئی نسلوں کو ادب کا پاکیزہ شعور عطا کیا۔ وہ قلم جو حسن و صداقت کی علامت بھی ہے اور مردانِ حق پرست کے لے مشعلِ راہ بھی۔ یہ قلم سدا سلامت رہے اور مجنوں صاحب کی نازک انگلیاں اس کے بوجھ سے کبھی نہ تھکیں۔

کلیم الدین احمد

صحیح معنوں میں نقاد وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے دماغ میں ہزاروں دماغوں کی صلاحیتیں یکجا ہوں۔ مجنوں گورکھپوری پر یہ خیال صادق آتا ہے۔ ان کے دماغ میں ایک بڑے نقاد، ایک بڑے افسانہ نگار، ایک بڑے شاعر اور ادیب کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

رسمی اور سطحی تنقید سے بوجھل ادبی فضا میں مجنوں گورکھپوری کی تنقید کی مثال تازہ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی ہے، جس نے مروجہ تنقیدی معیاروں اور قدروں کو صحت مند انداز میں منقلب کر دیا اور اس تنقید کی ابتدا ہوئی جو نہ سراسر تحسینی ہوتی ہے اور نہ سراسر مخالفانہ، بلکہ جو تجرباتی اور اثباتی تنقید ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے اردو نقادوں کے سامنے جرأت اظہار کی بے شمار بلیغ مثالیں پیش کیں اور بعض ان نکات کو بھی جنہیں ہمارے نقاد مسلمات میں شامل کر چکے تھے، اپنے قلم کی نوک سے کریدا اور انھیں حقیقت کی دھوپ دکھائی۔ حق بات یہ ہے کہ وہ اردو تنقید کے جزو اکبر ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

مجنوں جدید اردو تنقید کے علماؤں میں سے ہیں۔ مجھے تنقید کے زاویوں کا علم ان کی کتب سے ہوا۔ مجنوں زندگی اور ادب دونوں میں بلند مقام پر فائز ہیں۔

شوکت تھانوی

قد و قامت میں فتنہ، مگر باقی تمام حیثیتوں سے قیامت ادیب، نقاد، شاعر، افسانہ نگار، طالب علم، معلم سب ہی کچھ تو ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مجنوں کو شہرت بحیثیت ایک افسانہ نگار کے حاصل ہوئی۔ حالانکہ یہ خصوصیت اس کتب خانے کی صرف ایک الماری ہے۔ وہ شعر کہتے اور خطرناک حد تک سمجھتے ہیں گویا شعر و شاعری کے معاملے میں سمجھ دار اور خطرناک کا مجموعہ بن کر 'سمجھناک' ہو گئے ہیں۔ پھر طرّہ یہ ہے کہ منہ پھٹ بھی غضب کے ہیں۔ آپ کا ایک شعر سن کر

دادد یں گے تو دوسرا شعر سن کر 'مہمل' بھی اس صفائی سے کہہ دیں گے کہ آپ مُنہ دیکھ کر رہ جائیں گے۔ کسی سے مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہیں۔ البتہ اس آدھی چھٹانک کے آدمی سے بڑے بڑے پہاڑوں کو مرعوب ہوتے ہم نے خود دیکھا ہے۔

ڈاکٹر سلام بجنوری

مجنوں گورکھپوری گوناگوں شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر، افسانہ نگار، مترجم اور نقاد کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، مگر ان کی سب سے نمایاں حیثیت ایک نقاد کی ہے۔ اردو کے نقادوں میں وہ ایک اعلیٰ مقام کے مالک ہیں۔

وہ آہستہ آہستہ تاثراتی تنقید سے دامن بچاتے ہوئے سائنٹفک تنقید کے کوچے میں داخل ہو گئے ہیں اور جب اشتراکی تنقید کو اپنایا تو انھوں نے شاعری پر ماحول کے اثرات کا خاص طور سے جائزہ لیا۔

علی جواد زیدی

مجنوں گورکھپوری واحد ترقی پسند ہیں جنہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے کسی جلسے میں کبھی شرکت نہیں کی۔ لیکن کیا مجنوں کا ذکر کیے بغیر ترقی پسندی کی کوئی تاریخ لکھی جاسکتی ہے؟ شرکتِ انجمن اور شئے ہے اور نظریے کی نمائندگی اور ہی چیز ہے۔

ڈاکٹر عبدالودود

مجنوں ایسے نقاد ہیں جن کے نظریات وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہے ہیں جیسے جیسے ان کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا، ویسے ویسے ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ادب کو کیا اور کیسا ہونا چاہیے

اس کا ایک جواب مجنوں کے یہاں نہیں ملے گا۔ جب مطالعہ کی وسعت سے خیالات میں تبدیلی ہوگی تو نقاد کا پچھلا معیار تنقید غلط نظر آئے گا۔ مجنوں کے یہاں بھی یہی خوبی نظر آتی ہے۔ مجنوں فنکار کی تعفیف کرتے ہوئے اس کے تمام محاسن پیش کرتے جاتے ہیں۔ ان کی تمام توجہ اسلوب پر صرف ہوئی۔ وہ کمال اظہار کو شاعری کی اولین شرط قرار دیتے ہیں۔

ھاجرہ مسرور

مجنوں صاحب کو دیکھیے۔ جب بھی کسی محفل میں نظر آتے ہیں، تو ہر عمر کے لکھنے والے بڑے ذوق وشوق سے اُن کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مجنوں صاحب کو اس عالم میں دیکھو تو ان کے چہرے پر غرور کے بجائے سچے عالم، اونچے درجے کے ادیب اور نقاد اور دوستوں جیسے استاد کی معصومیت اور محبت کی کرنیں پھوٹتی ہیں، جن پر ریا اور مصلحت کوشی کی کوئی چھوٹ نہیں پڑتی

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس شخصیت کی تصویر بے شمار الفاظ سے بنائی جائے یا چند لفظوں میں، بنے گی وہی ایک پیاری من موہنی تصویر، جس میں چھل، کھٹ، تکبر یا احساس کمتری کے رنگوں میں سے کسی رنگ کی کوئی چھینٹ کوئی لکیر نہیں آئے گی۔

مختارزمن

مجنوں صاحب دلچسپ باتیں کرتے ہیں اور بڑے صاف گو بزرگ ہیں، لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے خاندانی جاگیرداری ماحول کا ذکر چل نکلا۔ کہنے لگے:

''میں بھی مزدور ہوں۔ پھاوڑا نہیں چلاتا مگر قلم چلاتا ہوں۔ کارلائل کا یہ قول مجھے پسند ہے کہ کام عبادت ہے۔

پھر اپنے خاص انداز سے مسکرائے اور بولے:

مگر، میری ذہنیت جاگیردارانہ ہے۔

میں چونکا اور میں نے پوچھا:

وہ کیسے؟

کہنے لگے:

میں اپنے خیالات میں اٹل ہوں۔ اپنے سے زیادہ اٹل آدمی خود میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہی تو جاگیرداروں کی خصوصیت ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر عبدالسلام

مجنوں نے اپنی اولین کتاب ہی میں ادب کے بعض بنیادی مسائل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اس عہد کے نقادوں اور ادب کے باشعور قارئین پر کافی اثر پڑا ہے۔ اس میدان میں انہوں نے اس عہد کے تمام بڑے نقادوں مثلاً کلیم الدین احمد، آل احمد سرور اور احتشام حسین سے پہلے قدم رکھا۔ کلیم الدین اردو کے نقادوں کے زیادہ قائل نہیں ہیں مگر مجنوں کی علمیت کے وہ بھی قائل ہیں۔

نصراللہ خان

گورکھپور بھی عجیب خطہ ہے۔ یہاں جو بھی پیدا ہوا باون گز کا۔ مجنوں صاحب کے والدِ گرامی دیوانہ گورکھپوری کا قد و قامت تو اس سے دو چار انگل نکلتا ہوا تھا۔ ان میں صرف دو باون گزوں کا نام ہم نے سنا ہے۔ ان میں ایک تو فراق ہیں اور دوسرے مجنوں۔ فراق ہندوستان میں رہ گئے۔ مجنوں پاکستان چلے آئے اور یوں گورکھپوریوں کی تقسیم عمل میں آئی۔ اگر مجنوں صاحب کے ادبی کارناموں کو پھیلا کر ان کے سن و سال سے ناپا جائے تو مجنوں صاحب اسم بامسمیٰ ثابت ہوں گے۔

پروفیسر سراج احمد علوی

میں نے ابوالکلام آزاد اور مرحوم نیاز کے بعد اگر کسی کو برجستہ اور برمحل شعر کہتے اور اپنی تالیفات اور تصنیفات میں جڑتے دیکھا ہے تو صرف اور صرف مجنوں کو۔ اس کا ثبوت ان کی کتابوں اور بالخصوص ان کے افسانوں سے مل سکتا ہے۔ فارسی میں خسرو، عرفی، نظیری، بیدل اور غالب، اردو میں میر، قائم اور آسی غازی پوری وغیرہ کے اشعار مضامین میں اس سلیقے سے پیش کرتے ہیں کہ ان کے مطالب واضح ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان کی ژرف نگاہی نہیں بلکہ ان کے حسن انتخاب کی بھی داد دینا پڑے گی۔

کتابوں کے ذوق کا واقعہ انھوں نے خود ایک بار سنایا کہ ان کے والد محترم جناب محمد فاروق دیوانہ، ایم۔ اے نے ایک اچھی خاصی رقم ان کو دی کہ مالگزاری جمع کرآئیں۔ گھر سے تم مجنوں صاحب اسی مقصد سے نکلے، لیکن واپس آئے تو کتابوں کی دکان پڑی اور پوری رقم کتابوں کی خرید میں ختم ہو گئی اور مالگزاری اپنی جگہ واجب الادا رہ گئی۔

انھیں اپنے مطالعہ کے انہماک سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے۔ پھر یہ کہ ان کی وسیع النظری اور دقت بینی آسانی سے کسی کی ہاں میں ہاں ملانا گوارہ نہیں کرتی تھی۔ وہ بڑے دم خم کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم رکھتے تھے۔ آخر وقت تک ان کی یہ ادائے خاص باقی رہی۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اس دور کے نقادوں میں ایک حلقہ ایسا ہے جن پر مشرقی روایات کا سایہ اتنا گہرا نہیں جتنا مغرب کی تحریکات، مغرب کے افکار اور نظریات کا اثر زیادہ گہرا اور نمایاں ہے۔ اس سلسلہ میں

عام طور پر مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی تنقیدوں میں تاثراتی انداز کے ساتھ ہی تنقید کا فکری پہلو بھی ملتا ہے اور ان کے تاثر میں فلسفے اور منطق کی گہرائی بھی ملتی ہے۔ انہوں نے مغربی ادبیات کا مطالعہ کیا ہے اور اس وسیع مطالعے کے اثرات ان کے یہاں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ یونانی دور سے لے کر بیسویں صدی تک مغربی تحریکات اور شعروفن کے مختلف نظریات اور بحثیں ان کے سامنے ہیں اور اس بصیرت نے ان کی تنقیدوں میں ایک وسعتِ نظر پیدا کر دی ہے۔ لیکن اس وسعتِ نظر میں اردو شاعری اور ادب کا مزاج گم ہو کر نہیں رہ جاتا۔

پروفیسر کرار حسین

ترقی پسند تحریک کے اندر مجنوں گورکھپوری کا جو مقام تھا اور تنقید کے اندر جو ان کا کنٹری بیوشن ہے وہ قابلِ قدر ہے۔

شان الحق حقی

مجنوں گورکھپوری برصغیر کے نابغات میں سے تھے۔ کراچی میں ان کا وجود یہاں کے اہلِ ادب کے لیے غنیمت تھا۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد واقعی اردو کی ادبی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کی خلش ہمیشہ رہے گی۔

رئیس امروہوی

مجنوں ہمارے اساتذہ میں سے تھے۔ انہیں مابعدالطبیعات پر بھی دسترس حاصل تھی۔ مجنوں صاحب اس عہد کے بڑے آدمی تھے۔

رئیس صاحب کے شعری خراجِ عقیدت سے انتخاب دیکھیے:

مجنوں کہ اس کا جوشِ جنوں ہے کمال ہوش
اس شخص کو پیمبرِ روحِ ادب لکھو
نقاد فن پسند و قلم کار ارجمند
جب آگہی ہو اسکی نگارش سے تب لکھو
دانش ور و مفکّر و صوفی و فلسفی
استادِ فن خطاب معلّم لقب لکھو

ڈاکٹرعبادت بریلوی

بیسویں صدی میں تاثراتی تنقید نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اس کے نتیجے میں اسے اپنے آپ کو بڑی حد تک بدلنا پڑا اور اس طرح اس میں بہت سے نئے تجربات ہوئے۔اس کے اثرات سب سے پہلے مہدی افادی کی تنقیدی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔اس کے بعد مجنوں نے اس میں نئے گل کھلائے۔تاثر کی اہمیت ذہن نشین کرائی۔حسن کے جدید تصورات پیش کیے اور ادب برائے ادب کے نظریے کو زندگی سے ہم آہنگ کیا۔حسن کی تلاش ان کے اس زمانے کی تنقید کا بنیادی عنصر ہے۔اس رجحانِ تنقید میں جو اضافہ انھوں نے کیا وہ یہی ہے کہ تاثراتی تنقید کو کسی حد تک عقل وشعور سے قریب لانے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک تجرباتی انداز کو بھی اس میں نمایاں کیا ہے۔

نثاراحمدفاروقی

حضرت مجنوں گورکھپوری بڑے دیدہ ور نقاد ہیں۔ان کی تنقید نے نئی نسل کے ذہنوں کی تعمیر کی ہے اور نئے ادب کی گذرگاہوں کو روشن کیا ہے۔ان تسامحات کے لیے ان کا فراخ دلی سے

اعتراف کرنا خود بہت قابل قدر بات ہے۔ اس سے ایک عمدہ نظیرہ قائم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غلطی کا امکان کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ کسی سہو یا غلط فہمی کا اعتراف نہ کرنا بہت بڑی ڈھٹائی ہے اور یہ عام طور سے پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ہمارے نقادوں میں لب ولہجہ کا کھرا پن اور دوٹوک بات کہنے کی ہمت پیدا نہیں ہوتی کہ اپنی غلطی سے واقف ہوکر لوگ شکر گزار ہونے کے بجائے بھڑک جاتے ہیں اور بحث کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق

مجنوں گورکھپوری اُن شخصیتوں میں سے ہیں جن سے ادب کا وقار قائم ہوتا ہے۔ اپنی بعض متضاد رایوں اور کچھ حیران کن جملوں کے باوجود ان کی تحریروں نے ادبی شعور کو کئی سمتوں میں آگے بڑھادیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے لیے ان کے کئی مضامین نہایت معتبر حوالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجنوں نے اپنے اتفاق اور اختلاف دونوں سے اردو ادب میں بحث ونظر کے نئے دروازے کھولے ہیں۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

مجنوں صاحب کئی زمانوں کے آدمی تھے کیوں کہ وہ کئی زبانوں کے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ تدریس ان کے لیے بوجھ نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہنگاموں کو سہل بنانے کا وسیلہ ہے۔ یوں نوجوان ذہنوں اور شخصیتوں سے ان کا رابطہ قائم رہتا ہے اور یوں وہ فکری اور ذہنی طور پر بوڑھے نہیں ہوتے۔

مجنوں صاحب نے ہر عنوان سے زندگی اور مستقبل کے ساتھ رشتے کو مضبوط رکھا۔ وہ زندگی سے یہ کہنے کا حق رکھتے تھے:

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں

علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

مجنوں صاحب نے خود بھی گردشِ لیل و نہار پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور ہمیں بھی یہ گُر سکھا گئے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

مجنوں صاحب کی موہنی شخصیت، زندگی کے بارے میں ان کا بے ریا اور بے لاگ رویہ، معاملات و مسائلِ حیات پر ان کی سوچی سمجھی اور غیر جذباتی رائے، ان کا چھا جانے والا انداز۔ ان کی افسانہ نگاری جس نے زندگی کا سلیقہ اور حوصلہ پیدا کیا۔ ان کی تنقید جس نے معاشرے اور ادب کے باہمی رابطے کو نمایاں کرنے کا فریضہ انجام دیا اور ایک صحت مند ادبی روایت بن کر لازوال ہوگئی۔ یہ جامعیت، یہ ہمہ گیری، یہ فیض رسائی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ عام طور پر عمر کی ایک خاص سطح پر پہنچ کر ماہرین فن بھ معاصرِ ادب کے مطالعے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں لیکن مجنوں صاحب ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ نو بہ نو کی تلاش اور مطالعے کے لیے وقف ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مجنوں گورکھپوری عمر و سال اور علم و فضل پر اعتبار سے عہدِ حاضر کے بزرگ ترین ادیب و نقاد ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے زندہ ادیبوں میں سے معتبر اور باوقار قلم اُن ہی کا ہے۔ اس اعتبار و وقار میں ان کی وسعتِ نظر اور توازنِ فکر کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ ان اوصاف کی بدولت ہماری ادبی تاریخ میں ان کا نام کوئی حوالے سے آتا رہے گا، لیکن دو حوالے ایسے ہیں جو

انھیں ہمیشہ ایک ممتاز مقام پر فائز رکھیں گے اور مستقبل کا ادب کسی نہ کسی طور پر انھیں اپنا ماخذ بنائے رکھے گا۔ میری مراد مجنوں کی افسانہ نگاری اور تنقید سے ہے۔

پروفیسر انجم اعظمی

وہ شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی اور اردو ادب کے ایک بزرگ نقاد بھی، لیکن ہر پیرایۂ اظہار میں مجنوں صاحب کی انفرادیت پوری طرح اجاگر ہے۔ ان کے ادبی سفر میں زندگی کے نئے افقوں کی تلاش اور تازہ تر علوم کی مسلسل لگن ملتی ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ آج بھی وہ کوئی مضمون لکھتے ہیں تو اپنے لکھے ہوئے کو کبھی دُہراتے نہیں۔ ان کے یہاں ایک مسلسل ارتقا نظر آتا ہے، جس کی مختلف کڑیوں کی نشان دہی ان کی ادبی خدمات کو سامنے رکھ کر کی جا سکتی ہے۔

صہبا لکھنوی

مجنوں صاحب نے پہلی بار اردو تنقید میں تجزیاتی تنقید کی طرح ڈالی۔ اس سے قبل اس نوع کی تنقیدی روایت کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ تنقید میں ایک نئی صنف کے اضافے کا سہرا بھی مجنوں صاحب کے سر ہے، جس کے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ اس طرز تنقید کو کسی اور نے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ اسلوب انہوں نے اپنی مشہور تصنیف ”پردیسی کے خطوط“ میں اپنایا، جس کے دو مجموعے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

واقعہ یہ ہے کہ تحریر کی شگفتگی، استدلال کی خوبی اور ادب و تنقید میں نئے مسائل کی نشان دہی کے سلسلے میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی تحریریں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی تقریباً تمام کتابیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حوالے کا کام دیتی ہیں۔

شبنم رومانی

عالم، معلم، ناقد، افسانہ نگار اور شاعر پروفیسر مجنوں گورکھپوری جیسا لکھتے ہیں ویسا ہی بولتے ہیں۔ان کے اسلوب تحریر اور اسلوب تقریر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ایک ایک فقرہ جامع، ایک ایک لفظ بلیغ، غالب شخص وشاعر، اس کی زندہ مثال ہے۔ یہ تقریریں انہوں نے محض حافظے کی بنیاد پر کیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ اکلوتی پاکستانی تصنیف غالبیات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مجنوں صاحب نے بھرپور مجلسی زندگی گزاری۔ وہ تمام عمر علمی، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں مؤثر طور پر شریک رہے ہیں۔ ذرا غور کیجیے، کیا یہ ہمارا اشرف نہیں ہے کہ ہم مجنوں گورکھپوری کے عہد میں زندہ ہیں۔ اپنے کانوں سے ان کو سُن رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

مجنوں گورکھپوری تو میرے ہمیشہ ایک محترم شخصیت رہے ہیں، جنہوں نے ساری عمر سنجیدگی اور توازن کے ساتھ قلم کو اس طور پر استعمال کیا ہے کہ ان کے اثرات سے کئی نسلوں کی آبیاری ہوئی۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں۔ میں نے مجنوں صاحب کی تحریروں سے اپنے ذہن کو جلا دی ہے۔ میں نے جناب مجنوں گورکھپوری کی کم وبیش ساری تحریریں پڑھی ہیں۔ان کی تحریروں کا سب سے بنیادی وصف اعتدال وتوازن ہے۔ وہ تنقید میں، جیسا کہ ہمارے پابند نقاد کرتے ہیں، کبھی جذبات کی رو میں نہیں بہکے۔ کبھی اپنی بات کو پہلے سے صحیح تسلیم کر کے اظہار خیال نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ہر پہلو سے کسی مسئلے یا بات پر غور کرتے ہیں اور توازن کے ساتھ اپنے

نتائج کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر بھڑکاتی نہیں ہے۔ بلکہ دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ وہ کھلے دماغ کے انسان ہیں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں آگے بڑھانے کا احساس ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے کبھی ادب کو پارٹی لائن کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا۔

رشیدنثار

ہمارے تنقیدی دبستان میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے تخلیقی نقاد کی حیثیت سے اردو تنقید کو جدلیاتی ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ اس سے پہلے جدلیاتی مزاج ادب کے لیے شجرِ ممنوعہ اور اس کا ذکر ایک خوف سے کم نہ تھا۔ مگر پروفیسر صاحب نے اپنے ارادے کی داستان بنا کر اور خود کو ایک کردار کا روپ دے کر تنقید کی تمثیلی زندگی میں نصف صدی بتا دی ہے۔

پروفیسر صاحب کی اپنی زندگی میں چونکہ شعور، دانش اور روشنی کو زیادہ دخل رہا ہے، اس لیے انھوں نے اپنے لیے افسانے کے بعد تنقید کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو جدلیاتی تنقید کا شعور دے کر صدیوں کا فاصلہ برسوں میں طے کیا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس

مجنوں گورکھپوری نے 'ادب اور زندگی' کے عنوان سے جو مضمون لکھا اور ان کی جو دوسری جو تحریریں سامنے آئیں ان میں نسبتاً ایک متوازن طریقِ فکر جھلکتا ہے اور وہ ماضی کے ادبی سرمائے کے مطالعے میں مارکسی نقطۂ نگاہ کے زیادہ تخلیقی اور معروضی استعمال پر زور دیتے ہیں۔ وہ یہ کہہ کر اختر حسین رائے پوری کے اس موقف کی تردید کرتے ہیں کہ:

"ماضی کی اہمیت سے انکار کرنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ تاریخ کا

مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ماضی کی کوتاہیوں میں اس طرح کھو کے رہ جانا کہ
زندگی کی تعمیر وتوسیع میں اس نے جس قدر حصہ لیا ہے اس سے بھی انکار
کردیا جائے تنگ نظری اور کم ظرفی کی علامت ہے۔"

ڈاکٹر شارب رُدولوی

ترقی پسند تنقید کے صفِ اول کے ناقدین میں مجنوں گورکھپوری کا نام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری اپنی ابتدائی تنقیدی تحریروں میں تاثراتی و جمالیاتی نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے بعد انھوں نے ادب کے زندگی اور سماج سے اٹوٹ رشتے پر زور دیا اور اردو ادب کی تفہیم اور تنقید و تجزیے میں اسی نقطہ نظر کو پیش کیا۔ مجنوں گورکھپوری ادب کو زندگی کا ترجمان ہی نہیں بلکہ زندگی کا نقاد بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادب انسانی خیالات وجذبات کا اظہار ہے لیکن ان خیالات و جذبات کی بنیاد تجربات پر ہوتی ہے اور ان کی جڑیں زندگی کے مادی حالات وعوارض میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے فلسفے اور تاریخ جمالیات پر بھی بہت اہم کام کیا ہے۔ ان کے کئی تنقیدی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تنقید بنیادی طور پر جد اتی اور سائنٹفک تنقید ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

مجنوں گورکھپوری جدید اردو ادب کے بانیوں کی مختصر ترین فہرست میں بھی اہم جگہ پاتے ہیں۔ وہ اوائل عمری ہی سے مغربی فلسفہ اور سائنس کے دقیق مباحث میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ مغربی فلاسفہ کے تازہ ترین مباحث کے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مباحث اردو زبان میں بھی آنے چاہئیں۔ خواہ یہ کام قدرے مشکل ہی کیوں نہ ہو۔ غالباً وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے

اپنے مضامین میں فلسفہ اور تاریخ کے مابین رشتوں پر مسلسل گفتگو کی ہے۔

اُن کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بہت پہلے کے ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی غیر ترقی پسند ادبا اور مفکرین کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری

ایک ایسے دور میں جب شخصیت نام کی چیز عنقا ہوتی جارہی ہے اور زمانہ زیادہ سے زیادہ شخصیت شکن ہوتا جارہا ہے۔ان میں آج بھی زندگی ہے، حوصلہ ہے، عزم ہے۔انہوں نے حال ہی میں ایک مطلع یہ کہا ہے:

جوتم ہو ساتھ، تو سارا جہاں بدل ڈالیں

زمیں بدل کے ابھی آسماں بدل ڈالیں

اس دور میں جب حالات کی ناساعت کا رونا عام ہے۔ بے دلی، بیزاری اور پست ہمتی کے رجحانات سر اٹھا رہے ہیں، مجنوں صاحب کا حوصلہ نئی نسل کے لیے ایک بیش بہا ارمغاں ہے۔ان کی رجائیت میں کشش اور معنویت اسی سبب ہے کہ وہ گرم و سرد زمانہ کے مزاج آشنا اور انسانی اقدار پر بھرپور یقین رکھتے ہیں۔ مجنوں صاحب ایک نادر الوجود شخصیت ہیں۔اپنی انسانی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جس سے عقیدت بھی ہو سکتی ہے اور محبت بھی۔

ارتضیٰ کریم

آج کے اختصاصی دور میں جب ہم مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی و تحقیقی نگارشات کا از سرِ نو مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی فکرِ مسلسل اور مطالعہ عمیق پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ جن تنقید نگاروں نے

ادب کی تفہیم و تفہم اور اس کے نظریات کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں ترین حصہ لیا ان میں مجنوں گورکھپوری کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس لیے کہ ان کا ادبی کام اپنے معاصرین میں کچھ زیادہ بھی ہے اور نئے پہلو بھی رکھتا ہے۔ ان کے ادبی سرمائے پر طائرانہ نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور افسانہ نویس بھی، تنقید نگار بھی تھے اور نظریہ ساز بھی، مترجم بھی تھے اور محقق و مدیر بھی۔ کم و بیش دس افسانوی مجموعے، آٹھ تراجم اور سولہ سترہ تنقیدی، تحقیقی اور فلسفیانہ مضامین کے انتخابات کسی ادیب کی ساٹھ سالہ زندگی میں تین درجن کتابیں اور پانچ چھ سال کی ادارتی مصروفیات کیا کم ہوتی ہیں؟ علاوہ ازیں مجنوں گورکھپوری اسم بامسمیٰ ثابت ہوئے ہیں۔ کسی شاعر کے مطابق 'مجنوں تو دہشت گرد تھا' ہم جہاں گرد ہیں۔ لیکن ہمارے مجنوں تو واقعی 'جہاں گرد' ہیں اور اگر مجنوںؔ آج بھی زندہ ہے تو اس میں اس کی ادبی جہاں گردی کا بڑا دخل ہے۔

حبیب احمد صدیقی

مجنوں گورکھپوری نے انگریزی کے توسط سے روس، جرمن اور فرانس کے ادب و فلسفہ اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کے ذہن میں اکثر خیالات انگریزی میں آتے اور ان کو بے تکلفی سے اردو کا جامہ پہناتے۔ جس سے ان کی انگریزی پر قدرت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

مجنوں غالب کے کردار کی خامیوں کے جواز کے سلسلے میں دور کی کوڑیاں لاتے ہیں اور جو دفاع کرتے ہیں اگر غالب کی زندگی میں کرتے تو شاید غالب بگڑ جاتے۔ انگریز حکام کی قصیدہ خوانی کے سلسلے میں غالب کا دفاع یوں کرتے ہیں کہ ہم آپ اس دور میں ہوتے تو ہم بھی یہی کرتے۔

ڈاکٹر عبدالستار نیازی

مجنوں گورکھپوری محض ایک شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک پورے عہد کا نام ہے اور ان کا ادبی سفر پون صدی پر مشتمل ہے۔ وہ ایک ہمہ داں اور قاموسی شخصیت تھے۔

احمد حسین صدیقی

افسانہ نگاری کے ساتھ مجنوں صاحب نے ترجمے کیے، تنقیدیں بھی لکھیں اور شاعری بھی کی۔ لیکن ان کی دو حیثیتیں بہت روشن اور متعین ہیں، ایک افسانہ نگار کی، دوسرے نقاد کی۔ وہ ایک بڑے شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور تھے۔ حکومت پاکستان نے اُنہیں نشانِ پاکستان سے نوازا۔ ۴ رجون ۱۹۸۸ء کو کراچی میں وفات ہوئی۔ سخی حسن کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

تحقیق و تنقید

مجنوں گورکھپوری اردو ادب کی ایسی ہمہ جہت شخصیت تھے جن کی شخصیت اور ادبی خدمات کے تذکرے کے بغیر تاریخ ادب اردو مکمل نہیں ہوسکتی اسی وجہ سے برصغیر میں جو بھی اہم تنقیدی کتب شائع ہوئی ہیں یا جو بھی تحقیقی کام ہوا ہے ان میں مجنوں صاحب کا تذکرہ لازم وملزوم رہا ہے۔ چند اہم کتابوں کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے تاکہ تحقیقی کام کرنے والوں کو آسانی ہوسکے:

۱۔ اردو شاعری، عبدالقادر سروری، انجمن امداد باہمی، حیدرآباد، ۱۹۳۲ء، مضمون کا عنوان: مجنوں گورکھپوری مستقبل کے شاعر اور افسانہ نگار

۲۔ تنقیدی سرمایہ (حصہ دوم)، عبدالشکور، فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، مضمون: مجنوں کی تنقید نگاری کا مطالعہ

۳۔ تنقیدی شعور، اختر تلہری، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۵۷ء، مضمون: مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مزعومات

۴۔ اردو تنقید کے معمار، ایم حبیب خاں، انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء، مضمون: مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری کا جائزہ از عبادت بریلوی

۵۔ وجہی سے عبدالحق تک، سید عبداللہ، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۶۵ء، مضمون: مجنوں کے تنقیدی خیالات اور ترقی پسندی

۶۔ اردو نثر میں ادب لطیف، ڈاکٹر عبدالودود خاں، نسیم بکڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۷ء، مضمون: مجنوں کی افسانہ نگاری کا جائزہ

۷۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء، مضمون: تین ترقی پسند نقاد (مجنوں گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسن)

۸۔ ارمغانِ مجنوں (جلد اول)، صہبا لکھنوی و شبنم رومانی، مجنوں اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۰ء

۹۔ تنقیدی تحریریں، عزیز اندوری، آشیانہ اندور، ۱۹۸۲ء، مضمون: مجنوں گورکھپوری کا اسلوب

۱۰۔ ارمغانِ مجنوں (جلد دوم)، صہبا لکھنوی و شبنم رومانی، مجنوں اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء

۱۱۔ یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، طاہر مسعود، مکتبۂ تخلیقِ ادب، کراچی، ۱۹۸۵ء، مجنوں اور دیگر ۱۹ ادیبوں کی شخصیت، تصورات، تخلیقی و علمی سرگرمیوں سے متعلق سوال و جواب کی صورت میں معلومات

۱۲۔ تخلیقی ادب، جلد۔۸، شمارہ۔۱، مدیر: مشفق خواجہ، کراچی، ۱۹۸۵ء، مضمون: مجنوں گورکھپوری کی شخصیت اور افسانہ نگاری، محمد علی صدیقی

۱۳۔ دوماہی الفاظ، گوشۂ مجنوں گورکھپوری، مرتب: نورالحسن نقوی، اطہر پرویز، اسدیار خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (جنوری تا اپریل) ۱۹۸۳ء

۱۴۔ مضامین، محمد علی صدیقی، ادارہ عصرِ نو، کراچی، ۱۹۹۱ء، مضمون: مجنوں گورکھپوری۔ایک تاثر

۱۵۔ معاصر اردو تنقید، پروفیسر شارب ردولوی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۴ء، مضمون: مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری از ارتضیٰ کریم

۱۶۔ مجنوں گورکھپوری ۔حیات و فن، ڈاکٹر عبدالستار نیازی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴ء

آخر الذکر کتاب ڈاکٹر عبدالستار نیازی کا تحقیقی مقالہ ہے جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ میرے علم کے مطابق پاکستان میں یہ پہلا تحقیقی مقالہ ہے جس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔

۶۷۶ صفحات کے اس تحقیقی مقالے میں نیازی صاحب نے مجنوں صاحب کی مختلف جہات یعنی شاعری، افسانہ نگاری، تنقید نگاری، ترجمہ نگاری، مقدمہ نگاری، مکتوب نگاری اور صحافت کے علاوہ ان کی سوانح اور ان کے اسلوب بیان پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ گوکہ یہ بہت ضخیم تحقیق ہے مگر ضرورت ہے کہ اس قسم کی اور بھی تحقیقات ہوتی رہنی چاہئیں۔

تصانیف

تنقید و فلسفہ

۱۔ شوپنہار، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۳۰ء
۲۔ تاریخ جمالیات، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۳۰ء
۳۔ افسانہ، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۳۶ء
۴۔ ادب اور زندگی، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۴۰ء
۵۔ اقبال، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۴۴ء
۶۔ تنقیدی حاشیے، ادارہ اشاعتِ اردو، حیدر آباد دکن، طبع اوّل، ۱۹۴۷ء
۷۔ نقوش و افکار، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، طبع اوّل، ۱۹۵۵ء
۸۔ نکات مجنوں، کتابستان، الہ آباد، طبع اوّل، ۱۹۵۷ء
۹۔ پردیسی کے خطوط (جلد اوّل)، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، طبع اوّل، ۱۹۵۷ء
۱۰۔ دوش و فردا، ادارہ انیس اردو، الہ آباد، طبع اوّل، ۱۹۵۹ء
۱۱۔ پردیسی کے خطوط (جلد دوم) مکتبہ جامعہ، دہلی، طبع اوّل، ۱۹۶۱ء
۱۲۔ شعر و غزل، ادبی اکیڈمی، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۶۳ء
۱۳۔ غزل سرا، مکتبہ جامعہ، دہلی، طبع اوّل، ۱۹۶۴ء
۱۴۔ غالب شخص اور شاعر، مکتبہ ارباب قلم، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۷۴ء

افسانہ/ناولٹ

۱۔ خواب وخیال، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۳۱ء
۲۔ سمن پوش، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۳۴ء
۳۔ ہتیا اور دوسرے افسانے، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اوّل، ۱۹۳۵ء
۴۔ سوگوار شباب، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۴۱ء
۵۔ گردش، کتب علم وادب، دہلی، طبع اوّل، ۱۹۴۳ء
۶۔ صیدِ زبوں، ادارہ اشاعتِ اردو، حیدر آباد دکن، طبع اوّل، ۱۹۴۳ء
۷۔ نقشِ ناہید، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۴۴ء
۸۔ سرنوشت، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن، طبع اوّل، ۱۹۴۴ء
۹۔ سراب، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن، طبع اوّل، ۱۹۴۵ء
۱۰۔ زیدی کا حشر، سی پی اردو اکیڈمی، ناگپور، طبع اوّل، ۱۹۴۶ء

تراجم

۱۔ سلومی، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۲۵ء
۲۔ آغازِ ہستی، نگار، بھوپال، طبع اوّل، جنوری رفروری ۱۹۲۷ء
۳۔ قابیل، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۳۰ء
۴۔ ابوالخمر، انوار بکڈ پو، لکھنؤ، طبع اوّل، ۱۹۳۹ء
۵۔ سنگھاسن بتیسی، مطبع نولکشور، لکھنؤ، طبع اوّل، ۱۹۴۰ء
۶۔ مریم مجدلانی، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۴۷ء
۷۔ کنگ لیئر، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، طبع اوّل، ۱۹۶۳ء

۸۔ شمسون مبارز، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۷۳ء

تالیفات

۱۔ مثنوی زہر عشق، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۳۰ء

۲۔ نیتاں (روداد مشاعرہ)، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۴۳ء

۳۔ مثنوی حسنِ فطرت، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، طبع اوّل، ۱۹۶۳ء

دیباچے، پیش لفظ و تبصرے

۱۔ پرواز (شعری مجموعہ)، علی سردار جعفری

۲۔ رگ جاں (شعری مجموعہ)، خورشید الاسلام

۳۔ پتھروں کا مغنی (شعری مجموعہ)، وحید اختر

۴۔ آئینۂ اعتبار (شعری مجموعہ)، اقبال شوقی

۵۔ جنبشِ لب (شعری مجموعہ)، نعیم جمالی

۶۔ نوائے بےنوا (شعری مجموعہ)، مسرت علی صدیقی

۷۔ صحرا سے گلستاں تک (شعری مجموعہ)، مبارک منگیری

۸۔ دھند میں آفتاب (شعری مجموعہ)، ثنا گورکھپوری

۹۔ داغ داغ اُجالا (شعری مجموعہ)، ساحل قزلباش

۱۰۔ صدیوں کا سفر (شعری مجموعہ)، نازش حیدری

۱۱۔ گرد راہ (خودنوشت)، اختر حسین رائے پوری

۱۲۔ مکالمات (تنقید)، ڈاکٹر محمد علی صدیقی

۱۳۔ مجاز سوانح و شخصیت (مقالہ)، محمد حسین دیپک

کتب و رسائل میں شائع شدہ چند تحریریں

۱۔ جان کیٹس، ماہنامہ، برقع، لکھنؤ، جنوری، ۱۹۲۷ء

۲۔ آغازِ ہستی، ماہنامہ، نگار، بھوپال، جنوری، فروری، ۱۹۲۷ء

۳۔ دور خیالی، ماہنامہ، حسن، لکھنؤ، فروری، ۱۹۳۰ء

۴۔ محبت کا انتقام، ماہنامہ، حسن، لکھنؤ، فروری، ۱۹۳۰ء

۵۔ خواب اور تعبیر، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، جنوری، فروری ۱۹۳۱ء

۶۔ جداگانہ انتخاب، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، مئی، جون ۱۹۳۱ء

۷۔ فلسفۂ یونان، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، جولائی تا اکتوبر ۱۹۳۱ء

۸۔ اشتراکیت کا نصب العین، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، اگست ۱۹۳۱ء

۹۔ فلسفۂ حدوث، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، جنوری، جنوری ۱۹۳۲ء

۱۰۔ دنیائے انسانیت کا مستقبل، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، جنوری ۱۹۳۲ء

۱۱۔ دی ژون، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، فروری تا مئی ۱۹۳۲ء

۱۲۔ گورکھپور کا گمنام شاعر، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، مارچ ۱۹۳۲ء

۱۳۔ دنیائے انسانیت کا مستقبل، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، فروری، اکتوبر، نومبر ۱۹۳۴ء

۱۴۔ استحالات عشق، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، اگست ۱۹۳۴ء

۱۵۔ یادگار مجنوں، ماہنامہ، ایوان، گورکھپور، جون ۱۹۳۵ء

۱۶۔ تنہائی، ماہنامہ، نقوش، لاہور، مارچ، اگست ۱۹۵۳ء

۱۷۔ تنہائی، ماہنامہ، نقوش، لاہور، اگست ۱۹۶۰ء

۱۸۔ ادب اور مقصد، ماہنامہ، افکار، کراچی، فروری ۱۹۶۰ء

۱۹۔ آتش کا نیا مطالعہ، ماہنامہ، ساقی، کراچی، جولائی ۱۹۶۰ء

۲۰۔ قمر زمانی کی یاد میں، ماہنامہ، ہماری زبان، علی گڑھ، جون ۱۹۶۳ء

۲۱۔ دیوان غالب اور اردو غزل، ماہنامہ، افکار، کراچی، فروری ۱۹۶۶ء

۲۲۔ غالب ہمہ رنگ، ماہنامہ، نگار، جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

۲۳۔ بہ مرگ من یاد آر، ماہنامہ، افکار، کراچی، جولائی ۱۹۷۳ء

۲۴۔ رونے والا فلسفی، ماہنامہ، قومی زبان، کراچی، جون ۱۹۸۸ء

۲۵۔ خودنوشت، ماہنامہ، قومی زبان، کراچی، جون ۱۹۸۸ء

۲۶۔ ایک بھولی ہوئی یاد، ماہنامہ، قومی زبان، کراچی، نومبر ۱۹۸۸ء

۲۷۔ حافظ اور المیہ، سہ ماہی، ارتقا، کراچی، فروری ۱۹۸۹ء

۲۸۔ ترقی پسند ادب۔ پچاس سالہ سفر، قمر رئیس، نیا سفر، دہلی ۱۹۸۷ء

حواشی

۱۔ ماہنامہ، دائرے، کراچی، جولائی ۱۹۸۸ء، ص: ۳۳

۲۔ مجنوں گورکھپوری، ایک تاثر، علی جوادزیدی، مشمولہ: ارمغانِ مجنوں (جلد دوم)، مجنوں اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص: ۵۱

۳۔ پردیسی کے خطوط (جلد دوم)، مجنوں گورکھپوری، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص: ۵۷

۴۔ مجنوں گورکھپوری اور نیاز و نگار، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مشمولہ: ارمغانِ مجنوں (جلد دوم)، مجنوں اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص: ۶۲

۵۔ تبصرہ، نیاز فتح پوری، ماہنامہ نگار، بھوپال، ستمبر ۱۹۳۰ء

۶۔ تبصرہ، نیاز فتح پوری، ماہنامہ نگار، بھوپال، اگست ۱۹۴۰ء

۷۔ اقبال (اجمالی جائزہ)، مجنوں، ایوانِ اشاعت گورکھپور، ۱۹۴۴ء، ص: ۱

۸۔ اقبال (اجمالی جائزہ)، مجنوں، ایوانِ اشاعت گورکھپور، ۱۹۴۴ء، ص: ۶۔۱

۹۔ میر اور ان کی شاعری، مشمولہ نکات مجنوں، پروفیسر احمد صدیقی مجنوں، کتابستان، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۵۷ء، ص: ۴۸

۱۰۔ مقدمات عبدالحق (جلد دوم)، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۴۱ء، ص: ۲۰۱

کتابیات

۱۔ آج کا ادب، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، قمر کتاب گھر، کراچی ۱۹۸۲ء

۲۔ ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری، مکتبہ پاکستان، لاہور ۱۹۵۶ء

۳۔ ترقی پسند ادب، قمر رئیس و عاشور کاظمی، نیا سفر، دہلی، ۱۹۸۷ء

۴۔ نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، رائل بک کمپنی، کراچی ۱۹۸۵ء

۵۔ اصول تنقید اور ردعمل، سید محمد عقیل، تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد ۲۰۰۴ء

۶۔ ادب اور روشن خیالی، سبط حسن، مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۹۰ء

۷۔ تنقیدی مباحث، پروفیسر شارب ردولوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۵ء

۸۔ نئے رنگ نئے ڈھنگ، احمد ہمدانی، سیپ پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۹۶ء

۹۔ ادب اور عصری جہت، ڈاکٹر آغا سہیل، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۹۱ء

۱۰۔ اردو نثر کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۷ء

۱۱۔ ادب اور سماجیات، قدوس جاوید، کتاب محل، الہ آباد ۱۹۹۴ء

۱۲۔ مضامین، محمد علی صدیقی، ادارہ عصرِ نو، کراچی ۱۹۹۱ء

۱۳۔ اردو فکشن کی تنقید، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ملک بکڈپو، لاہور ۱۹۹۷ء

۱۴۔ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۸۵ء

۱۵۔ جستجو، ڈاکٹر تحسین فراقی، یونیورسل بکس، لاہور ۱۹۸۷ء

۱۶۔ ترقی پسند ادب کی تشکیل جدید، ثاقب رزمی، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۸۷ء

۱۷۔ ادب اور روشن خیالی، سید جعفر احمد، مکتبۂ دانیال، کراچی ۱۹۹۰ء

۱۸۔ معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء

۱۹۔ اردو میں ترقی پسند تحریک، خلیل الرحمان اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۴ء

۲۰۔ میری دنیا، رفیق چوہدری، رنگ پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۷ء

۲۱۔ روشنائی، سجاد ظہیر، مکتبۂ دانیال، کراچی ۱۹۷۶ء

۲۲۔ ترقی پسند تنقید کا ارتقا اور احتشام حسین، شمیم بیگم، اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۷ء

۲۳۔ ردِ عمل، شہزاد منظر، منظر پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۵ء

۲۴۔ جدید اردو تنقید کے معمار، ڈاکٹر عبد السلام، رائل بک ایجنسی، کراچی ۱۹۹۷ء

۲۵۔ ترجمہ کا فن اور روایت، ڈاکٹر قمر رئیس، تاج پبلشنگ، دہلی ۱۹۷۶ء

۲۶۔ تابِ سخن، محمد رضا کاظمی، مکتبۂ دانیال، کراچی ۱۹۹۶ء

۲۷۔ گفتگو، مظہر جمیل، مکتبۂ دانیال، کراچی ۱۹۸۶ء

۲۸۔ ادب و شعور، ممتاز حسین، اردو مرکز، لاہور ۱۹۶۱ء

۲۹۔ داستانِ وفا، وفا راشدی، مکتبہ اشاعت اردو، کراچی ۱۹۹۷ء

۳۰۔ منزلیں گرد کی مانند، خلیق ابراہیم خلیق، فضلی سنز، کراچی ۱۹۹۹ء

۳۱۔ داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۶ء

۳۲۔ مثنوی زہرِ عشق اور اسکے نقاد، محمد حسن، ادارہ مطبوعات، کراچی ۱۹۶۲ء

۳۳۔ نیم رخ، مجتبیٰ حسین، مکتبۂ عالیہ، لاہور ۱۹۸۴ء

۳۴۔ فکر و فن کے محرکات، اظہر قادری، آہنگ نو، کراچی ۲۰۰۱ء

۳۵۔ ترقی پسند ادب، عزیز احمد، کاروانِ ادب، ملتان ۱۹۹۳ء

رسائل و اخبارات

۱۔ ارتقا، سہ ماہی، کراچی
۲۔ افکار، ماہنامہ، کراچی
۳۔ الشجاع، ماہنامہ، کراچی
۴۔ تہذیب، ماہنامہ، کراچی
۵۔ دائرے، ماہنامہ، کراچی
۶۔ سب رس، ماہنامہ، کراچی
۷۔ طلوع افکار، ماہنامہ، کراچی
۸۔ قومی زبان، ماہنامہ، کراچی
۹۔ نقوش، شخصیات نمبر، لاہور
۱۰۔ نگار، ماہنامہ، کراچی
۱۱۔ نیا دور، فراق نمبر، لکھنؤ
۱۲۔ ہم سخن، پندرہ روزہ، کراچی
۱۳۔ جنگ، ماہنامہ، کراچی
۱۴۔ نوائے وقت، ماہنامہ، کراچی
۱۵۔ حریت، ماہنامہ، کراچی
۱۶۔ امن، ماہنامہ، کراچی
۱۷۔ جسارت، ماہنامہ، کراچی
۱۸۔ مشرق، ماہنامہ، کراچی
۱۹۔ اسٹار، ماہنامہ، کراچی
۲۰۔ ڈان، ماہنامہ، کراچی